اکادمی ادبیات پاکستان
پاکستانی
ادب کے
معمار
محمد عثمان ڈیپلائی: شخصیت اور فن
آفاق صدیقی

پاکستانی ادب کے معمار

محمد عثمان ڈیپلائی
شخصیت اور فن

آفاق صدیقی

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	فخر زمان
منتظم	خالد اقبال یاسر
تدوین و طباعت	سعیدہ درانی
اشاعت	2009
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	گل اعوان پرنٹنگ پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد 160 روپے غیر مجلد 150 روپے

ISBN: 978-969-472-170-5

Pakistani Adab Kay Maimar

Muhammad Usman Diplai : Shakhsiyat-aur-Fun

Compiled By

Afaq Siddique

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad, Pakistan

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

پیش نامہ

پاکستانی زبانوں میں ہمارے مشاہیر نے پاکستانی ادب کے حوالے سے جو کام کیا ہے کسی بھی بین الاقوامی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان مشاہیر کے علمی و ادبی کام اور اُن کی حیات کے بارے میں معلومات کو کتابی صورت میں لانے کے لیے پاکستانی ادب کے معمار کے نام سے اشاعتی منصوبہ شروع کیا ہے جس کے تحت پاکستانی زبانوں کے مشاہیر پر کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔

محمد عثمان ڈیپلائی ایک ہمہ صفت شخص تھے۔ جدید سندھی ادب کی بہت سی اصناف میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ صرف ادیب، ایڈیٹر، پبلشر، ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس نہیں تھے بلکہ ایک اچھے نقاد بھی تھے۔ ان کی مزاح نگاری کا بھی ایک مخصوص انداز ہے۔ انہوں نے ادب اور صحافت کے ذریعے اجتماعی و قومی کاموں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ایک بے باک صحافی تھے انہوں نہ صرف اپنی تحریروں سے سماجی برائیوں کے خلاف جہاد کیا بلکہ عملی طور پر بھی سرگرم عمل رہے انہوں نے توہم پرستی اور رجعت پرستی کے خلاف قلمی جہاد کیا ہے۔

تحقیق و تدوین میں بھی وہ درجہ کمال پر فائز تھے۔ انھوں نے جدید سندھی ادب کے خزانے کو نہایت پُر مایہ بنا دیا ہے۔

اسی اشاعتی منصوبے کی ایک کتاب "محمد عثمان ڈیپلائی: شخصیت اور فن" اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر ملک کی معروف ادیب آفاق صدیقی صاحب نے تالیف کی ہے۔ اس کتاب سے یقیناً اہل ادب اور عام قاری محمد عثمان ڈیپلائی کی فن و شخصیت سے بہتر طور پر آگاہ ہو سکیں گے۔

یہ کتاب محمد عثمان ڈیپلائی کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت کی حامل ہوگی۔ امید ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کی کتاب ''محمد عثمان ڈیپلائی: شخصیت اور فن'' کو ملک اور بیرون ملک یقیناً پسند کیا جائے گا۔

فخر زمان

پیش لفظ

برسوں پہلے کا ذکر ہے میں شام کے وقت حسب معمول شیخ ایازؔ کے ساتھ ان کے دفتر (کوئنس روڈ سکھر) میں بیٹھا تھا کہ اچانک ایک بزرگ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے تشریف لائے۔ سر سے پاؤں تک بڑے نستعلیق یعنی سر پہ جناح کیپ قسم کی ٹوپی، آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ، چہرے پر ستواں، لمبی اور کھڑی ناک، ترشے ہوئے سے باریک ہونٹ، روشن سیاہ آنکھیں، چوڑی پیشانی، جسمانی ہیئت پر بڑھاپے کے آثار مگر بڑے چاق و چوبند۔ بدن پر بند گلے کی واسکٹ، سفید شلوار اور کُرتے میں ملبوس ــــ متناسب و موزوں قد و قامت اور کمرے میں داخل ہونے کا پُروقار انداز۔

شیخ ایاز نے کھڑے ہو کر بڑے احترام سے موصوف کا استقبال کیا۔ تپاک سے گلے ملے۔ مجھ سے بھی بڑی شفقت سے سندھی روایات کے مطابق بغلگیر ہوئے اور مزاج پُرسی کی۔

شیخ ایازؔ نے بتایا ''آفاق! یہ محمد عثمان ڈیپلائی صاحب ہیں۔ بوڑھے نوجوان'' میں نے برجستہ کہا ''ڈیپلائی صاحب کا نام تو بہت سنا ہے اور پڑھا بھی ہے۔ یہ میری خوش نصیبی کہ ملاقات آج ہو رہی ہے۔''

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء سے اب تک جن اکابرین سندھ کی دید و شنید نے مجھے بہت متاثر کیا، ڈیپلائی صاحب کا نام ان شخصیات میں نمایاں ہے جنھوں نے بڑی سخت آزمائشوں میں بچپن، نوجوانی، جوانی اور پھر ڈھلتی عمر کے دن گزارے مگر ہمیشہ قلم کے دھنی رہے

سندھ میں عوامی بیداری اور سماجی بہبود کی جتنی بھی تحریکیں اُبھریں موصوف کی قلمی جدوجہد ان میں شامل رہی۔ انہوں نے مولانا عبدالحلیم شررؔ کے انداز کی افسانوی تحریریں جو تاریخ اسلام سے

ماخوذ تھیں سندھی ناولوں کی صورت میں سندھ کی تہذیبی و ثقافتی روایات کے ساتھ پیش کیں اور اصلاحی افسانے بھی لکھے جن میں شگفتہ بیانی کی دلکشی کے ساتھ ساتھ سندھ کے مظلوم عوام یعنی ہاریوں، مزدوروں اور دیگر محنت کشوں کے جذبوں کی ترجمانی ملتی ہے۔

ایک قومی مصلح، بے باک ادیب و صحافی اور شاعر کی حیثیت سے انھوں نے پوری زندگی میراث پیغمبراں یعنی علم و ادب کے فروغ اور مثبت و تعمیری عملی جدوجہد میں بسر کی۔ ان کی ثابت قدمی اور ایثار نفسی مثالی درجہ رکھتی ہے جس کا اعتراف بیشتر ممتاز اہل قلم نے کیا ہے۔

شاعری کی طرف وہ زیادہ توجہ نہ دے سکے البتہ صحافت اور افسانوی ادب کی تاریخ میں ان کے کارنامے زندہ رہیں گے۔

سندھ کی سوہنی دھرتی اور اس دھرتی کے باسیوں سے ڈیپلائی صاحب کو بے پناہ محبت تھی اس محبت کا اظہار ان کی تحریروں میں جابجا موجود ہے۔

سندھی زبان کا مشہور و مقبول روزنامہ ''عبرت'' جو حیدرآباد سندھ سے شائع ہوتا ہے اس کی بنیاد موصوف ہی نے رکھی تھی۔ ان کے جاری کردہ ہفت روزہ 'انسان' کے شماروں نے سندھ کی سماجی، سیاسی اور تمدنی زندگی میں جو تحرک پیدا کیا اس کے حوالے آج بھی دیئے جاتے ہیں۔

وہ نڈر، جرأت مند اور ثابت قدم ادیب و صحافی تھے۔ بے باکی سے تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کے قائدین میں شامل رہے۔ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہوئے مگر کبھی ہمت نہ ہارے۔ خصوصاً جب ون یونٹ کا قیام عمل میں آیا اور پھر اس کے بعد آمریت کا دور دورہ ہوا تو سندھی زبان و ادب اور اہل سندھ کے معاشی و معاشرتی حقوق پر ضرب کاری لگی جس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ سندھی قومیت کی تحریک بہت ہی جوش و خروش سے ابھری۔ ڈیپلائی صاحب نے 'جیئے سندھ' کے نعرے کو اپناتے ہوئے مذکورہ تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔

میں نے اس مضمون کے آغاز میں موصوف سے پہلی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ جس شام ہماری قربت پذیر ہوئی وہ شیخ ایاز اور مجھ سے سندھی زبان و ادب اور سیاسی کشمکش پر خاصی دیر تک گفتگو

فرماتے رہے۔ اسی رات ان کو حیدرآباد واپس جانا تھا۔ میں نے درخواست کی کہ میرا جی چاہتا ہے آج آپ غریب خانے پر شب بسری فرمائیں۔

ڈیپلائی صاحب نے میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔ رات کے کھانے کا انتظام تو ایاز صاحب نے نشاط ہوٹل میں کرلیا تھا۔ گھر پہنچ کر تھوڑی سی خاطر تواضع کے بعد ہماری بات چیت شروع ہوئی اور خیر سے شیخ عبدالرزاق 'راز' بھی معزز مہمان سے ملنے آ گئے، بڑی پُرلطف گفتگو ہوتی رہی۔

دراصل اس مصاحبے کا مقصد ڈیپلائی صاحب کی زبانی، ان کی زندگی اور کارناموں کے احوال سے بہرہ ور ہونا تھا۔

وہ سندھی اور اُردو میں بڑی روانی اور سادہ بیانی سے ہمارے سوالوں کے دلچسپ جوابات دیتے رہے۔ ان کے لہجے کی مٹھاس اور لفظ و بیاں کی دلکشی اتنی اثر آفریں تھی کہ ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔''

جہاں تک اُن کی شخصیت اور تصنیفی کارناموں کا سوال ہے تو اس سلسلے میں ممتاز اہلِ قلم نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان تجزیوں، تبصروں اور مضامین سے اردو میں بھی ایسی ہی ضخیم کتاب شائع ہو سکتی ہے جیسی سندھی، اردو اور انگریزی کی تحریروں کو یکجا کر کے تاج جویو نے ''سندھ مانک موتی تنظیم'' کے زیرِ اہتمام حیدرآباد سے شائع کی ہے۔

آفاق صدیقی

حالات زندگی

دنیائے علم وادب میں ایسی مثال کم ہی ملے گی کہ کسی بلند پایہ شخصیت کو اپنے وطن اور جائے ولادت سے ایسی نسبت ہو کہ وہی مکانی نسبت، اصل نام کی بجائے شخصیت کی پہچان بن جائے۔
پاکستانی ادب کی معماروں کی کہکشاں میں ڈیپلائی وہ ممتاز ادیب، صحافی اور صاحب فکر وعمل تھے جن کا نام تو محمد عثمان ہے مگر تھر پارکر کے بے آب وگیاہ ریگزار میں ڈیپلو نام کی بستی میں جنم لینے کے باعث انھوں نے اسے اپنے نام میں اس طرح شامل کر لیا کہ تمام تر شہرت ومقبولیت اُن کی عرفیت 'ڈیپلائی' میں سمٹ گئی۔

'ڈیپلو' میں ایک چھوٹا کاروباری میمن گھرانہ عرصے سے آباد تھا، اسی گھرانے سے تعلق رکھنے والے ایک نیک نام فرد حبیب اللہ میمن تھے جو محنت ومشقت سے اپنے کنبے کی کفالت کرتے تھے۔
خالقِ حقیقی نے ۱۳رجون ۱۹۰۸ء کو انہیں ایک فرزندِ ارجمند عطا کیا جس کا نام انھوں نے محمد عثمان رکھا۔

حبیب اللہ میمن بذات خود تو شاعر وادیب نہ تھے البتہ علمی وادبی کتابیں پڑھنے کا ذوق وشوق رہا جس کا اثر ان کے ہونہار بیٹے پر پڑا جسے اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی۔ ابتدائی تعلیم وتربیت خانگی ماحول میں ہوئی پھر 'ڈیپلو' میں ہی سندھی کی ساتویں جماعت تک پڑھا مگر چھوٹی عمر کے باعث آخری امتحان نہ دیا جسے اس زمانے میں فائنل کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے والد کے کاروباری معمولات میں شریک ہو گئے۔

پڑھنے لکھنے کا ذوق وشوق دل ودماغ میں شدت سے موجود رہا۔ فارسی، عربی، اردو اور انگریزی کتابیں بھی پڑھیں اور نوعمری میں مضامین لکھنے لگے۔ ۱۹۲۴ء میں پہلا مضمون اردو میں دہلی کے

مشہور و معروف جریدے 'منادی' نے شائع کیا تو شوق بڑھا اور مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ صحافت پر مائل ہوئے جس کا پہلا نقش دیں۔ گیارہ برس کی عمر میں اپنے ہم جماعت دوستوں کے لیے لکھے گئے دستی جریدہ 'فرحت آثار' کے نام سے طالب علمی کے زمانے میں اجاگر کرچکے تھے لیکن نوجوانی کے دن آئے تو گھر کی معاشی پریشانیوں نے آس پاس کی بڑی بستیوں مثلاً بدین، میرپورخاص اور عمرکوٹ میں منشی گیری کے سلسلے قائم کیے، مگر نوکری کی محنت ومشقت کے دوران یا فراغت ہونے کے بعد جو بھی وقت ملتا اس کو کتابیں پڑھنے اور مضمون لکھنے پر صرف کرتے۔

اس زمانے میں عبدالحلیم شرر کے نیم تاریخی ناولوں کا بڑا شہرہ تھا۔ ڈیپلائی صاحب نے ان کے کئی ناول پڑھے اور یہ اثر ہوا کہ خود بھی کہانیاں لکھنے لگے۔

۱۹۲ء میں پہلا سندھی افسانہ لکھا جس کا عنوان تھا ''چاند حسین ہے یا انسان'' ایسی خوبصورت تحریروں کی بدولت حیدرآباد کے حکیم عبدالخالق نے اس جوہر قابل کو پہچانا، ملاقات ہوئی تو حکیم صاحب نے قرآنی دعاؤں پر مشتمل ایک کتاب لکھنے کا کام سونپا۔ یہ مسلم ادبی سوسائٹی کی پیشکش تھی جسے انتہائی ذمہ داری اور بڑی لگن سے پیش کیا گیا۔ اس قابل قدر پیشکش پر مسلم ادبی سوسائٹی نے انعام و اکرام سے بھی نوازا۔ کتاب کا نام 'قرآنی دعائیں' تھا اور یہ پہلی کتاب تھی جس پر ان کے نام کے ساتھ ڈیپلائی کی چھاپ لگی اور ایسی لگی کہ ان کے نام اور کام کا استعارہ بن گئی۔ (۱۹۳۶ء)

ڈیپلائی صاحب کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی کرنے والوں میں ایک اور شخصیت مولوی خیر محمد نظامانی کی تھی جنہوں نے ان کے افسانوں اور ناولوں کی اشاعت کا ذمہ تو لیا مگر عملاً کچھ نہ کرسکے۔

۱۹۳۲ء میں افسانوں کا پہلا مجموعہ 'گلشن عبرت' کے نام سے منظر عام پر آیا اور بہت مقبول ہوا۔

ڈیپلائی صاحب کے سوانحی کوائف خود ان کی اپنی تحریروں میں خاصی تفصیل سے موجود ہیں اور ان میں عمومی دلچسپی کی طرحداری ہے مثلاً "آپ بیتی" یعنی خودنوشت سوانح (چھوٹا آدمی چھوٹی باتیں) کے زیرعنوان وہ لکھتے ہیں:

''۱۳ جون ۱۹۰۸ء کی صبح کو میں نے موضع ڈیپلو کے ایک غریب گھرانے میں جنم لیا۔ کیوں کہ

یری پیدائش سے پہلے پانچ بہنیں پیدا ہو چکی تھیں اس لیے میری بوڑھی دادی خوشی میں اتنی بیتاب
ہوئی کہ اپنے بہو یعنی میری والدہ کا نام تک بھول گئیں۔"

''ڈیپلو سندھ کے جنوب میں تھر کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔جس کے مشرقی جانب والی ٹیلے کی
چوٹی پر چڑھیں تو کچھ کے کالے ڈونگر (پہاڑ) کی چوٹی نظر آئے"۔

''غریب ہو یا تونگر بیٹے کی چاہت سبھی کو ہوتی ہے سو میری ماں بھی ہر لحظہ دعائیں کرتی تھی
ور میری بلائیں لیتی تھی"۔

''میری پیدائش کے دو سال بعد میرا بھائی ہارون پیدا ہوا لیکن آٹھ برس کی عمر میں وفات پا گیا
۔ایک مرتبہ گاؤں میں کوئی جوگی آیا تھا جو دست شناسی کا ماہر تھا۔میری ماں نے اسے اپنا ہاتھ دکھایا
تو وہ لکیروں کو دیکھ کر بولا 'تیرے نصیب میں بیٹا نہیں ہے۔' پھر اس سامی (جوگی) نے میرے والد
سے ہاتھ دکھانے کو کہا۔وہ اگرچہ پیر صاحب پاگارہ کے مرید تھے مگر دست شناسی وغیرہ کے قائل
نہ تھے اس لیے سامی کو ہاتھ دکھائے بغیر ہی ماں کو بتایا کہ سامی نے کہا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں
دو بیٹوں کی لکیریں ہیں۔"

ڈیپلائی صاحب کی مذکورہ خودنوشت سوانح خاصی طویل ہے اس لیے میں اپنے طور پر ان کی
سندھی تحریر سے خاص خاص باتیں ہی بیان کر رہا ہوں مثلاً یہ کہ ان کے والد حبیب اللہ میمن
صاحب کو اپنے بچوں سے بڑی محبت تھی اور وہ ایک کو اپنی گود میں، دوسرے کو شانوں پر بٹھا کر
اور تیسرے کی انگلی تھام کر سیر سپاٹے کے لیے گاؤں سے باہر لے جاتے، گود میں زیادہ تر انہیں
ہی اٹھاتے تھے۔

پانچ برس کی عمر میں گاؤں کے دوسرے بچوں کی طرح اسکول میں داخل ہوئے۔ پہلے
استاد ماسٹر عبداللہ تھے۔آگے چل کر جن اساتذہ سے ربط رہا ان میں پونم چند، رام جی مل،
حاجی ابوطالب اور وسیع مطالعے والے صوفی استاد عبدالرحیم کے نام یاد ہیں۔ان استادوں کے
دو لطیفے سنانے والے پیر محمد اور آریہ سماجی مبلغ ھیم راج جو قرآن شریف کے ریکارڈ بڑی چاہ

سے سنتے تھے ان دونوں سے بھی کسب فیض کیا۔ حصول تعلیم میں جس دوست کی پیروی کی وہ قاضی حاجی علی محمد تھے جو جماعت میں اول آتے یا ڈیپلائی اول ہوتے۔ اول و دوم آنے کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہم دونوں ایک ہی طرح کے اخبارات اور کتابیں پڑھنے کا ذوق و شوق رکھتے تھے۔ ان کے والد کی وفات ہوگئی۔ اس لیے چار جماعتیں پاس کرنے کے بعد بیس میل دور شہر کے ای۔ وی۔ اسکول میں انگریزی پڑھنے نہ جا سکے اور میں پانچ بہنوں کا ایک بھائی ہونے کے سبب انگریزی نہ پڑھ سکا اور جب سانٹھ برس کا ہوگیا تو میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ قاضی صاحب اپنے کاروبار اور زمینداری کے کاموں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے مگر ہماری دوستی ایسی تھی کہ اسکول کی تعلیم کے بعد ہم دونوں نے فارسی اور کچھ عربی پڑھی''۔

''ایک سال فارسی پڑھنے کے بعد والد صاحب کے ساتھ کاروباری مشاغل میں مصروف ہوگیا تاہم جتنا کچھ بھی فراغت کا وقت ملا اس میں تھوڑی گجراتی، ہندی، انگریزی اور گرمکھی زبانیں سیکھتا رہا اردو پر بھی اچھا خاصا عبور حاصل ہوگیا''۔

''۱۸ برس کی عمر میں ۱۹۲۵ء کے دوران شادی ہوگئی۔ کچھ عرصہ بعد ٹنڈو باگو میں جہاں ہمارا کاروبار تھا، موسلا دھار سیلابی بارش ہوئی، کاروبار چوپٹ ہوگیا مجبوراً نوکری کی فکر کرنی پڑی۔ سرکاری نوکری کا اہل اس لیے نہ تھا کہ سندھی فائنل کا امتحان نہیں پاس کیا تھا۔ 'الوحید' اخبار میں میونسپلٹی کے ناکہ منشی کا اشتہار دیکھا تو درخواست بھیج دی، حالانکہ متعلقہ شہر ڈیپلو سے کافی فاصلے پر تھا''۔

''حسن اتفاق کہ چیئرمین صاحب کو میرے حروف اتنے پسند آئے کہ میرے حق میں حکم صادر کر دیا۔ وہاں ایک پیر صاحب سے واقفیت تھی وہ بھی اَن دیکھی۔ بہرکیف جا کر ملا تو حال احوال پوچھا اور کہا 'یہ نوکری تم جیسے مومن صفت کے بس کی نہیں۔ یہاں کے ممبر اتنے بدمعاش ہیں جو آپس میں لڑنے کے سبب ناکہ منشی بھی باہر سے بلواتے ہیں، تم بھلا ان سے کیونکر نباہ کر سکو گے؟'

''بہت افسردہ ہوگیا تو میری حالت دیکھتے ہوئے پیر سائیں نے فرمایا' ادھر تنخواہ ۱۸ روپے

ماہانہ ہے تم ۲۰؍روپیہ ماہانہ تنخواہ پر میرے فلاں مرید وڈیرے کے پاس جاؤ اور ساتھ میں میری چٹھی لے لو۔ ان دنوں گیہوں دو روپیہ من فروخت ہوتا تھا۔

جب ڈیپلائی اس وڈیرے کے پاس پہنچے تو ناخواندہ ہوتے ہوئے بھی اس نے درخواست کو اس طرح دیکھا جیسے وہی پڑھا لکھا شخص دیکھتا ہے، پھر کہنے لگا " حروف خوشخط نہیں ہیں اس لیے دس روپے دیے جائیں گے قبول ہو تو ٹھہر جاؤ ورنہ واپس جاؤ"۔

پیٹ کی مجبوری بھی عجب ہے بیچارے عثمان ڈیپلائی کو وڈیرہ سائیں کی خدمت میں رہنا پڑا۔ پیر سائیں کو بھی اپنا حال بتایا مگر کوئی جواب نہ پایا اور نہ وہ پیر دو مہینے تک ادھر آیا، پھر آیا بھی ہو تو ڈیپلائی کی تنخواہ کے مسئلے پر کوئی بات نہیں کی۔

وڈیرے صاحب کے پاس جیسے تیسے چار مہینے گزارے وہ بھی کچھ ایسی حالت میں کہ سخت محنت اور تمام تر کوششوں کے باوجود اس عرصے میں اپنے گاؤں جانے کی اجازت نہ ملی۔

وڈیرہ سائیں کے کئی اور منشی بھی تھے اُن سب میں زیادہ پڑھے لکھے، ایماندار اور فرض شناس ڈیپلائی صاحب ہی تھے۔ یہ احساس اسے اچھی طرح تھا پر کبھی ظاہر نہ کیا شاید یہ بھی کوئی وڈیرہ شاہی کی خاص ادا تھی۔ ہاں قدر دانی کا ارادہ بھی کیا تو اس وقت جب کم تنخواہ اور سخت محنت سے اکتا کر ڈیپلائی صاحب نے ملازمت سے چھٹکارا پانے کی ٹھان لی۔

سوا چار مہینے تک تو وڈیرے نے دس روپے سے ایک پیسہ بھی نہ بڑھایا مگر جب یہ دیکھا کہ ایسا کام کا ایماندار منشی نوکری چھوڑ رہا ہے تو کہا " اب تمہیں پندرہ روپے ماہوار دوں گا بیشک تم اپنے گاؤں چلے جاؤ مگر جلد واپس آ جانا۔"

اپنے گاؤں جانے سے پہلے ڈیپلائی نے ایک خط پیر سائیں کو لکھ بھیجا جنھوں نے کسی دوسرے خاص مرید سے نوکری کی بات طے کر لی یعنی بتیس روپیہ ماہوار تنخواہ، سال میں دو تھان کپڑوں کے لیے اور دو مرتبہ گھر جانے کی چھٹی۔

پیر سائیں کی طرف سے یہ خط ملا تو ڈیپلائی کو بڑی خوشی ہوئی۔ دو ہفتے اپنے گھر یعنی ڈیپلو میں

رہنے کے بعد نئی نوکری پر گئے تو ان صاحب کو بہت خوش اور مہربان پایا۔

ادھر پہلے والے وڈیرہ سائیں کو ڈیپلائی کے نوکری پر واپس نہ آنے کے سبب بہت غصہ آیا اور وہ بری بری گالیاں دے کر اپنے منشیوں کو تاکید کرتا رہا کہ "تم ہرگز نمک حرامی نہ کرنا۔"

ڈیپلائی تک یہ باتیں پہنچیں تو خوف آیا کہ بااثر آدمی ہے کوئی انتقامی کارروائی نہ کرے لیکن کچھ ہی دن بیتے کہ وڈیرہ وفات پا گیا۔

دوسرے زمیندار کی ملازمت میں ڈیپلائی چھ برس رہے۔ وہ ان کے کام کا اتنا قدر دان نکلا کہ پیار میں انہیں "انجن" کا لقب دے دیا۔ اعتماد اس قدر کہ اگر اپنی اہلیہ کو لے کر کہیں باہر جاتا تو بیگم کے خاص کمرے کی کنجی بھی ڈیپلائی کو دے جاتا۔ اتنے اعتماد کے باوجود ماہانہ تنخواہ میں چھ سال کے دوران صرف ایک مرتبہ پانچ روپے کا اضافہ کیا۔

ڈیپلائی کو ایک اور زمیندار کے پاس بہتر ملازمت مل گئی جو مزاج کے اعتبار سے بہت سخت تھا مگر تنخواہ بڑھانے میں کشادہ دل۔ چنانچہ یہ اس کی ملازمت میں بیس برس رہے اور تنخواہ بڑھتے بڑھتے پانچ سو روپے تک پہنچ گئی۔

دوران ملازمت قریب قریب سو کتابیں لکھیں اور شائع کرائیں۔ زمیندار نے کبھی اس بارے میں کوئی روک ٹوک نہ کی تاہم تعریف و توصیف اور حوصلہ افزائی کرنا زمیندار مذکور کے خلاف اصول تھا۔

جس خودنوشت کے حوالے سے یہ احوال رقم کر رہا ہوں اس میں ڈیپلائی صاحب نے بعض مقامات پر اپنی افتادِ طبع اور علم و ادب کی سچی لگن کے بڑے دلچسپ پہلو بیان کیے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ:

"ہر جگہ میں نے ہاریوں پر ظلم، نوکر شاہی کے مکروفریب، عیش پرستیاں، کنواری لڑکیوں کو پھانسنے اور للچانے کے طور طریقے، غریبوں کی حق تلفیاں اور جبری محنت و مشقت کے ظالمانہ انداز دیکھے ہیں۔"

ظاہر ہے متعلقہ ماحول سے انہیں اپنی کہانیوں کے لیے طرح طرح کے سماجی موضوعات ملے اور ان کا قلم بڑی بے باکی سے اپنے سماج کی کہانیاں لکھتا رہا۔

اپنی ملازمت کے حوالے سے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ:

''یہ عجیب بات تھی کہ میں نے جس زمیندار کی بھی ملازمت چھوڑی وہ تھوڑے عرصے کے بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔ میں جہاں بھی رہا پوری دیانت داری سے اپنا فرض انجام دیا جس کی وجہ سے ملازمت میں رکھنے والوں نے بھی مجھ سے اچھا سلوک کیا اور آج تک ان کے لیے میں نیک نام ہوں میرے دل میں بھی ان کی عزت ہے تاہم تیس برسوں تک مختلف صورتوں میں ان سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی میں خالی ہاتھ رہا ورنہ عموماً ایسے بااثر لوگوں کے پاس رہنے والے اپنی جائیدادیں اور ملکیتیں بناتے ہیں۔ اُن سے تو کیا میں نے عالیشان پریس، ماہنامے ہفت روزے اور روزنامے شائع کرتے ہوئے بھی کوئی کمائی نہیں کی سوائے نیک نامی کے اور یہی بات میسنوں کے اصول کی سخت خلاف ورزی ہوئی۔ اس لیے قریبی عزیزوں کے نزدیک بھی حقارت کا باعث بنا مگر خدائے پاک نے مجھ پر جو نوازشیں کیں ان کو اپنے لیے باعثِ فخر جانتا ہوں اور حیرت زدہ کہ جن کی نظر میں زیادہ رقومات ہی بڑی سے بڑی نعمت ہیں وہ عاقبت کی خبر نہیں رکھتے۔''

جیسا کہ مندرجہ بالا عبارت سے بھی ظاہر ہوتا ہے ڈیپلائی صاحب ادب وصحافت میں قلم کے دھنی رہے۔ اپنی عمر عزیز کے ماہ وسال کا تجزیہ کرتے ہوئے اور اپنی قلمی جولانیوں کو شمار میں لاتے ہوئے ان کا یہ کہنا حق بجانب محسوس ہوتا ہے کہ:

''میں نے ۶۵ برسوں کے دوران جو عبرتناک واقعات دیکھے ان کو کسی کی بھی بدنامی سے ماورا افسانوی رنگ میں بیان کرتا رہا ہوں اور کرتا رہوں گا چاہے کچھ لوگوں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہوں۔''

جب موصوف ۷۰ برس کے ہو گئے تو خود نوشت میں تحریر فرماتے ہیں:

''عمر اب ستر برس کی ہوگئی، پورے پانچ سال ہلکے فالج اور بلڈ پریشر کی بیماریوں میں مبتلا ہوں۔ چالیس برس پہلے اولین کتاب شائع کی اور جب دس برسوں کی کوششیں کامیاب ہوئیں،

ملک آزاد ہوا تو بڑی خوشی ہوئی اور اب قومی اصلاح کی جدوجہد تیز کر دی لیکن انسانیت کے دشمنوں کو یہ کوششیں پسند نہ آئیں اور بغیر کسی جرم کے قید میں ڈال دیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر ثابت قدمی سے قید و بند کا زمانہ بھی گزار دیا۔ اسی عرصے میں رسالہ 'انسان' جاری کرنے کا منصوبہ بنایا۔'' (یہ منصوبہ انہوں نے فیض احمد فیض کے مشورے سے ترتیب دیا جوان کے ساتھ سنہ 1959ء میں لاہور کے شاہی قلعہ کے جیل میں نظر بند تھے۔ مصنف)۔

سیلف انٹرویو

خود نوشت سوانح سے قطع نظر، ڈیپلائی صاحب کا سیلف انٹرویو بھی بہت دلچسپ ہے جس میں اول تا آخر وہ خود ہی سوال اٹھاتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے ہیں۔ یہ سوانحی مصاحبہ موصوف کی زندگی کے حالات و واقعات کی عکاسی کرتا ہے جس کے جستہ جستہ حصے کچھ یوں ہیں۔

سوال: آپ نے کب سے لکھنا شروع کیا؟

جواب: ۱۹۱۹ء میں اسکول کی طالبعلمی کے دوران اپنے ہاتھ سے ہفتہ وار اخبار 'فرحت آثار' ترتیب دیتا اور دوستوں کو پڑھنے کے لیے دیتا تھا۔

سوال: آپ کے مضامین کب شائع ہونا شروع ہوئے؟

جواب: ۱۹۲۴ء میں اردو اخبار 'منادی' دہلی نے پھر اردو رسالہ 'دین دنیا' دہلی نے میرے مضامین چھاپنا شروع کئے جس کے بعد سندھی رسالہ 'ترقی' میں پہلا افسانہ "چاند سو بنایا انسان" چھپا۔ دوسرا افسانہ "فریب دولت" ۱۹۲۷ء کے قریب 'علمی دنیا' میں شامل اشاعت ہوا۔ تیسرا افسانہ 'نیت کا پھل'، رسالہ 'کامیابی' میں، چوتھا افسانہ 'اقبال کی بہن' رسالہ 'مخلص' میں۔ پانچواں افسانہ 'زمانے کی گردش' کے عنوان سے اسی جریدے میں شائع ہوا اور پھر 'عبرت' اور 'مہران' میں افسانے چھپتے رہے جبکہ مضامین کی اشاعت 'نئین زندگی' میں ہوتی رہی۔

سوال: آپ نے ڈرامے بھی لکھے؟

جواب: ہاں پہلا ڈرامہ 'غیرت عرف نور جہاں کا بیٹا'، دوسرا 'شادی' تیسرا 'کورٹ ناٹک'،

ہوتھا' 'ڈاکٹر ناٹک'، پانچواں 'آزاد انتخاب' پھر تواتر سے 'پنچائتی'' پدمنی'، 'ڈکار'، 'کانگریس'، 'مرزا غازی بیگ' اور کئی دوسرے ڈرامے شائع ہوئے، اسٹیج پر پیش کئے گئے اور ریڈیو سے نشر ہوئے۔

سوال: کن کتابوں پر انعام ملے؟

جواب: پہلی کتاب 'قرآنی دعاؤں' پر مسلم ادبی سوسائٹی نے ۱۹۳۶ء میں انعام دیا۔ 'گلشن عبرت' پر بورڈ آف سندھی لٹریچر کا انعام، پھر ناول 'امڑ' (ماں) پر سندھی ساھتیہ نے انعام دیا۔ ناول 'سانگھڑ' پر پاکستان رائٹرز گلڈ کا انعام ملا۔ آخری ناول 'انقلاب ایران' کو بھی ۱۹۸۰ء میں بہترین ناول ہونے کا پاکستان رائٹرز گلڈ ادبی انعام دیا گیا۔

سوال: کہانیاں اور ناول لکھنے کا شوق کیسے ہوا؟

جواب: بچپن سے کہانیاں اور ناول پڑھنے کا شوق تھا۔ کچھ ایسا شوق کہ قرآن شریف کی تفسیر میں بھی کہانیاں ہی پڑھتا تھا۔ تاریخ سے دلچسپی تھی اور اسکول میں تاریخ کا جو سبق پڑھتا وہ مجھے یاد ہو جاتا۔

ایک مرتبہ استاد قاضی عبدالرحیم مرحوم نے خوش ہو کر پورے مہینے مجھے اول درجے کے مارکس (Marks) دیے۔ میرا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ مولانا عبدالحلیم شرر کا ناول 'فلورا فلورنڈا' مجھے صرف ایک دن کے لیے ملا جو پڑھ کر شام کو واپس کر دیا۔ ناول کا متن مجھے یاد ہو گیا۔ اسی طرح الف لیلہ کی کہانیاں یاد ہو گئیں۔

غریب ہونے کے سبب پیسوں سے تو کتاب خرید نہیں سکتا تھا البتہ لائبریری سے لے کر یا کسی سے کتاب مانگ کر پڑھتا تھا۔

اس سوال کے جواب میں کہ آپ نے کون کون سے علوم پڑھے؟ جواب میں لکھتے ہیں:

''میں علم جفر، نجوم اور رمل وغیرہ کچھ کچھ جانتا ہوں مگر ان میں سے ایک پر بھی ایمان نہیں۔''

تحریر کردہ مضامین کے بارے میں بتایا ہے کہ ''میں شروعات میں لکھ کر اپنے دوستوں کو سناتا تھا پھر ان کی اشاعت ہونے لگی۔ دوسو سے زیادہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین، ڈرامے اور افسانے لکھے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جن حضرات پر طنزیہ اور تنقیدی مضامین لکھتا تھا ان کو بھی پسند آتے تھے۔"

اپنی نگارشات کی اثر آفرینی کے بارے میں کئی واقعات رقم کئے ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ:

"ایک مرتبہ میرپور خاص سے ٹنڈو کوٹ کی گاڑی میں ڈیپلو جا رہا تھا تو ایک ۳۵ یا ۳۶ برس کا جوان میرے قریب آ کر بڑے ادب سے ملا اور کہا 'آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہے' میں نے پوچھا 'بھائی! میں تو تمہیں جانتا پہچانتا نہیں' تب وہ بولا 'آپ نے ایک دفعہ اخبار میں لکھا تھا کہ اے سست سندھی اُستادو! اب تم کو موقعہ ملا ہے کہ ادیب کا امتحان پاس کر کے میٹرک پاس کرو نہیں تو نئے میٹرک پاس ماسٹر تم سے بالاتر ہو جائیں گے۔ جب میں نے یہ پڑھا تو جوش آیا اور ادیب، ادیب عالم اور ادیب فاضل کر کے بی۔اے کیا پھر ایم۔اے بھی کر ڈالا اور فی الوقت کالج میں لیکچرر ہوں۔"

ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں ایک نوجوان فوٹوگرافر کی دکان کے قریب سے گزرا تو اس نے بطور خاص مجھے چائے پینے کی دعوت دی اور رنگین فوٹو بنا کر مجھے دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے دوستوں کا گروپ آپ کی کتاب پڑھ کر اپنے مرشدوں سے باغی ہو گیا۔"

اپنے والد محترم کا ذکر خیر مذکورہ انٹرویو میں کچھ یوں فرمایا ہے کہ:

"اول اول اپنی کوئی کتاب چھپنے سے پہلے والد مرحوم کو دیتا تھا کہ نظر ثانی فرمائیں اور جو لفظ مشکل محسوس ہو اس کو بدل دیں۔ وہ سندھی کی چھ جماعتیں پڑھے ہوئے تھے۔ ان کی کتابوں میں ایک پرانی چوتھی جماعت کی کتاب کو بھی میں نے دیکھا جس کی ایک کہانی مجھے یاد ہے (اس طرح میری تصانیف کی زبان نہایت عام فہم ہو گئی)۔"

ڈیپلائی صاحب کو بیرون ملک جانے کے مواقع بھی ملے اور بقول ان کے:

"میں نے دال دلیا اور چاولوں کی آش سے لے کر نیویارک کے چائنیز ہوٹل میں ۲۲ ڈشوں والا کھانا بھی کھایا۔ میں پیدل چلنے کے علاوہ گدھے کی سواری سے بڑھتے بڑھتے ہوائی جہاز کے

سفر سے بھی لُطف اندوز ہوا ہوں۔ میں زمین پر ہاتھ سرہانے رکھ کر بھی سویا ہوں اور ہلٹن ہوٹل کے بستر پر بھی خوابِ راحت کے مزے لوٹے ہیں۔ میں نے کنویں کے کھارے پانی کو پیا ہے اور ہر طرح کے مشروب بھی نوشِ جاں کیے ہیں۔ میں نے سیدوں کے گھروں کی ہی نہیں اچھوتوں اور بہت سے غریبوں کے گھروں کی روٹی بھی کھائی ہے۔''

نثر نگاری کے ساتھ ساتھ موصوف کو شعر و شاعری کا ذوق و شوق بھی رہا۔ اس بارے میں خود ان کا کہنا یہ ہے کہ:

''میں نے جوانی کے دنوں میں کچھ عشقیہ کلام اور کچھ مقصدی منظومات کہیں پھر ڈراموں میں مکالموں اور کرداروں کی مناسبت سے اشعار موزوں کئے۔ تقریباتی سلسلے میں بھی شعر لکھے لیکن آگے چل کر یہ شوق برقرار نہ رہ سکا، شاید بیس پچیس اشعار ہی کہے ہوں گے۔''

خود نوشت سوانحی سلسلے کی تحریروں میں ڈیپلائی صاحب نے ہمہ جہت معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے کہ محدود صفحات میں اس کو سمیٹنا خاصا دشوار لگتا ہے مثلاً جو کتابیں انہوں نے لکھیں ان میں سے بحق سرکار ضبط کی جانے والی کتابوں کی تفصیلات وغیرہ ہیں جن کو تصانیف کے باب میں رقم کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ذوق شعری کا جو مختصر سا حوالہ ان کے اپنے الفاظ میں پیش کیا آئندہ صفحات میں اشعار کے ساتھ ان کی خوبیوں پر بھی بات ہوگی۔

اپنی معروضات کے اس مرحلے پر ڈیپلائی صاحب کے فرزند جناب محمد علی ڈیپلائی کی قابل قدر نگارشات سے کسب فیض بھی ضروری ہے۔ موصوف نے 'ڈیپلائی کا خاندان'، 'ڈیپلائی صاحب کا فکری سفر'، 'ڈیپلائی کی پریس'، 'ڈیپلائی کی کتابیں کیوں ضبط ہوئیں' اور 'ڈیپلائی'، 'ڈیپلائی کیسے بنے؟' جیسے عنوانات پر خاصے تفصیلی مضامین لکھے ہیں جن کی اجمالی صورتیں بھی اگر پیش کروں تو کافی صفحات درکار ہوں گے اس لیے سب سے پہلے خاندان کے بارے میں شجرۂ نسب کا حوالہ، جو کچھ یوں ہے'' محمد عثمان ڈیپلائی ولد حبیب اللہ ولد الیاس ولد جبو ولد محمد ولد حبیب ولد عثمان''

ڈیپلائی صاحب کے جدّ امجد یعنی 'جبو' پیر سائیں پاگارہ کے مرید ہوگئے اس لیے ان کا تعلق 'گوٹھ ونگی' اور 'پائیلی' والوں سے ہوگیا۔ پھر ڈیپلو آباد ہونے پر فقیر پیر بخش کے گھر کی شمالی جانب آ کر گھر بنایا۔ 'جبو' کی اہلیہ کا نام فاطمہ تھا۔

ڈیپلائی صاحب کی معلومات کے مطابق شاید ۱۹۰۰ء میں رن کچھ سے ایک ندی گزرتی تھی جس کے کنارے بلھیاری قصبہ تھا جہاں میران تالپور کا قلعہ بھی موجود تھا۔ پھر زلزلے کے سبب ندی کا وجود نہ رہا اور بلھیاری ویران ہوگیا اس لیے وہاں آباد میروں نے ڈیپلو آ کر کچا قلعہ بنوایا۔

ڈیپلو میں میمن برادری کا پہلا گھر ہاشم کا تھا جو میروں کے ملازم تھے اور ان کو چودھری بھی کہا جاتا تھا۔

ڈیپلائی صاحب کی یادداشتوں کے مطابق ان کے والد حبیب اللہ ایک غریب چھوٹے بیوپاری تھے، وہ ڈیپلو کے قریب 'گوٹھ پائیلی' میں بیوپار کرتے تھے۔ ڈیپلائی صاحب کی ولادت کے بعد انہوں نے ڈیپلو میں دکان کھولی جو بارہ تیرہ برسوں میں ختم ہوگئی کیونکہ زیادہ مصروفیت کاروباری سلسلے میں 'پائیلی' ہی سے وابستہ تھی اور دوطرفہ دیکھ بھال مشکل تھی۔

حبیب اللہ صاحب کی وفات ۵۱-۱۹۵۰ء کے لگ بھگ حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کی اہلیہ یعنی ڈیپلائی صاحب کی والدہ کا نام تاج بائی تھا جنہوں نے ۱۹۴۵ء کے دوران ڈیپلو میں وفات پائی۔

ڈیپلائی کے ایک بھائی جن کا نام ہارون تھا کمسنی میں انتقال کر گئے، سات بہنیں تھیں جن میں سے چار تو چھوٹی عمروں میں فوت ہوگئیں باقی تین جن کے نام 'وسندی' 'رحیماں' اور 'حلیماں' ہیں ان کی شادیاں اچھے گھرانوں میں ہوئیں سب نے لمبی عمریں پائیں اور آسودہ حال کنبے چھوڑے۔

ڈیپلائی صاحب کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی صفیہ بائی سے ۱۹۲۵ء میں ہوئی جو ایک بیٹی کو جنم دے کر ۱۹۲۷ء میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ دوسری شادی سکینہ بائی سے ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ محترمہ نے ۱۹۷۴ء میں وفات پائی۔

○ پہلی بیوی سے جو بیٹی تھی ان کا نام ملکہ خانم تھا جو ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئیں اور ۲۰۰۲ء میں

انتقال کر گئیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے پروفیسر ڈاکٹر محمد علی، لیاقت میڈیکل یونیورسٹی میں بائیوکیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے انچارج پروفیسر رہ چکے ہیں۔ ان کے دو بیٹے فیضان اور رحمان ہیں۔ مرحومہ کی بیٹی ڈاکٹر زینت کا انتقال ۱۹۹۷ء میں ہوا۔

- دوسری بیوی سے پہلی بیٹی عائشہ خانم کی ولادت ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ ان کے چار فرزند ڈاکٹر محمود گل، لیفٹیننٹ کمانڈر غلام اللہ، انجینیر عرفان اللہ، اور عمران اللہ اور تین صاحبزادیاں کلثوم، ساجدہ اور سعیدہ ہیں۔
- دوسری صاحبزادی فاطمہ فرحت کی ولادت ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ ان کے چار فرزند انجینیر محمد رفیق، ریاض احمد، ڈاکٹر آفتاب احمد اور فہد اور چار بیٹیاں رضیہ، افشین، شبانہ اور فرزانہ ہیں۔
- تیسری صاحبزادی پروفیسر ڈاکٹر نسیم اختر (ثریا سوز قاضی) نے ۱۹۴۵ء میں جنم لیا۔ اپنے والد محترم پر تحقیقی کام کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی ہوئیں۔ ان کے پانچ فرزند انجینیر ظفر قاضی، انجینیر اظہر قاضی، ڈاکٹر جاوید قاضی، انجینیر محمود اقبال اور عدنان قاضی ہیں۔ دو بیٹیاں ملکہ اور نغمہ ہیں۔ اُن کا انتقال ۲۰۰۴ء میں ہوا۔
- چوتھی صاحبزادی زینت یاسمین ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئیں یہ بہبود آبادی کے محکمے میں ایڈیشنل سیکریٹری تھیں۔ حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ ان کے دو بیٹے عدیل گل اور ذوالفقار علی اور دو بیٹیاں حمیرا اور سحر ش ہیں۔
- پانچویں صاحبزادی زرتاج کی پیدائش ۱۹۴۹ء میں ہوئی اور جلد ہی وفات پا گئیں۔

فرزندان

- محمد ہارون کی ولادت ۱۹۳۲ء میں ہوئی جو چھوٹی عمر میں ہی انتقال کر گئے۔
- محمد صالح ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے اور کمسنی میں ہی وفات پا گئے۔
- محمد علی ڈیپلائی کی ولادت ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔ ۱۹۶۵ء میں سینٹرل سپیریر سروسز کا امتحان پاس کیا، اعلیٰ مرکزی سروس میں داخل ہوئے۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء میں ریٹائر ہونے کے بعد محمد عثمان

ڈیپلائی ٹرسٹ کے تحت تعلیمی، ثقافتی اور ہنرمندوں کا مرکز قائم کیا۔ اُن کی تین بیٹیاں ڈاکٹر فرحانہ، پروفیسر خالدہ رفیق اور رفیعہ ریاض ہیں۔ تینوں شادی شدہ اور عیال دار ہیں۔

○ عبدالرحمان ڈیپلائی کی ولادت جنوری ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور دیہی ترقیاتی محکمے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے دو فرزند محمد عثمان اور محمد صالح ہیں۔ چار بیٹیاں سکینہ، زرینہ، عروج اور آمنہ ہیں۔

○ ڈاکٹر حبیب الرحمن کی ولادت دسمبر ۱۹۵۲ء میں ہوئی اور ۱۹۹۴ء میں وفات پا گئے۔ ۱۹۷۰ء میں سندھی زبان کی تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ لالہ قادر اور دوسرے رہنماؤں کے ساتھ بھوک ہڑتال میں شریک ہوئے اور گرفتار کیے گئے۔ ان کی اولاد میں ایک بیٹا ہارون حبیب اور دو بیٹیاں عائشہ اور بشریٰ شامل ہیں۔

ڈیپلائی صاحب کے حالاتِ زندگی اُن کی خودنوشت سوانح اور سیلف انٹرویو کے علاوہ تفصیل سے ان کے صاحبزادے جناب محمد علی ڈیپلائی کے تحریر کردہ مضامین میں درج ذیل عنوانات کے تحت موجود ہیں۔

۱۔ ڈیپلائی کا خاندان ۲۔ ڈیپلائی صاحب کا فکری سفر ۳۔ ڈیپلائی کا پریس ۴۔ ڈیپلائی کی کتابیں کیوں ضبط ہوئیں اور ۵۔ 'ڈیپلائی' ڈیپلائی کیسے بنے۔

ڈیپلائی صاحب کی صاحبزادی نسیم اختر (ادبی نام ثریا سوز ڈیپلائی) ایک معروف افسانہ نگار اور شاعرہ تھیں۔ انہوں نے اپنے والدِ محترم کی شخصیت اور کارناموں پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ دو سال قبل ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

سندھی ادب کی تواریخ اور متعدد اخبارات و رسائل میں بھی سوانحی کوائف شائع ہوتے رہے ہیں تاہم اُردو میں ان کی شخصیت اور فن پر یہ پہلی کتاب ہے جو اکادمی ادبیات کے زیرِ اہتمام منظرِ عام پر آ رہی ہے۔

ادبی خدمات

ڈیپلائی صاحب جیسا کہ حالات زندگی میں بیان کیا جاچکا ہے ۱۳ جون ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے اور ۷ فروری ۱۹۸۱ء کو وفات پائی گویا قریب قریب ۷۳ برس کی عمر پائی اور اس عمر عزیز کے ساٹھ برس ادبی وصحافتی خدمات میں بسر ہوئے۔

- ۱۹۔۱۹۱۸ء میں جب پرائمری درجات میں زیر تعلیم تھے مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا اور ایک دستی اخبار 'فرحت آثار' اپنے دوستوں کو پڑھانے کی غرض سے نکالا۔
- ۱۹۲۴ء میں باقاعدہ پہلا مضمون اردو میں محمد بن قاسم پر لکھا جس کی اشاعت خواجہ حسن نظامی کے رسالہ 'منادی' دہلی میں ہوئی۔
- پہلا افسانہ سندھی میں 'حسين چنڊ ۾ انسان' کے عنوان سے لکھا جس کی اشاعت رسالہ 'ترقی' ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔
- پہلا ڈرامہ ''غيرت عرف نورجهان جو پٽ'' ۱۹۴۱ء میں لکھا۔
- پہلی کتاب 'قراني دعائون' کے نام سے لکھی جسے مسلم ادبی سوسائٹی نے شائع کرایا اور انعام دیا۔ (۱۹۳۶ء)
- افسانوں کا پہلا مجموعہ 'گلشن عبرت' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ مسلم ادبی سوسائٹی نے اسے بھی انعام دیا۔ (۱۹۳۵ء)
- پہلا ناول 'سنگدل شهزادي' ۱۹۳۸ء اپنے ادارے اسلامیہ دارالاشاعت میرپور خاص سے شائع کرایا۔

○ پہلا ناول جو بحق سرکار ضبط کیا گیا ۱۹۴۲ء میں ذاعری زنگ محل' کے نام سے چھپا تھا اس کے بعد ۱۹۷۵ء تک کئی کتابیں ضبط ہوئیں مثلاً گلستان حسن ،(۱۹۵۰ء) [illegible] جی آزادی جی جنگ (۱۹۵۷ء)، غازی انور پاشا (۱۹۵۷ء)، اسلامی تمدن (۱۹۵۷ء) امر (ماں) ناول (۱۹۶۱ء)، شیخ المشائخ (۱۹۷۵ء)

ذنجانی صاحب کی ضبط شدہ کتابوں کے علاوہ اُن کے اخباروں اور رسالوں پر بھی سرکاری پابندی لگتی رہی مثلاً ہفت روزہ اخبار 'انسان'، روزنامہ 'سندھ ٹائمس' وغیرہ۔

اب ان کتابوں کے نام ملاحظہ ہوں جو انعام یافتہ ہیں۔

۱-قراني دعائون ۲- گلشن عبرت ۳- امڑ (ماں) ناول۔

۴- مشہور ناول 'سانگیڑ' جسے رائٹرز گلڈ ادبی انعام ملا۔ انقلاب ایران (اس کتاب کو بھی رائٹرز گلڈ ادبی انعام ملا)

یہ ایک لائق تحسین اور غیر معمولی بات ہے کہ اُن کی پہلی اور آخری کتاب، دونوں کو اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا۔

تصانيف

(الف) چيده چيده اسلامي تاريخي ناول

۱-روم جي راڻي-۲-هوشربا نازنين-۳-ڪاراڪافر-

۴-نازنين يورپ-۵-دختراسلام-۶-شاه امان الله

۷-فتح فلسطين-۸-نيل ڪنوار-۹-غازي صلاح الدين-

۱۰-فتح اسپين-۱۱-آخري اميد-۱۲-سلطان غوري-

۱۳- ڪنيز اسلام-۱۴- ٽيپو سلطان-۱۵-حيدر علي-

۱۶-ايراني شهزادي-۱۷-فتح اسلام-۱۸-نورتوحيد-

۱۹-جلوه اسلام-۲۰-فتح ايران-۲۱-شير شاه ۽ همايون-

۲۲-عروج اسلام ۲۳-گمراه مسافر عرف هندو مسلم اتحاد-

۲۴-شوڪت اسلام-۲۵- سومنات جي سندري-۲۶-گلستان حسن-

۲۷-غازي اورنگ زيب-۲۸-غازي محمود غزنوي-۲۹-هوشرباشهزادي

۳۰-حوربغداد-۳۱-نازنين سمرنا-۳۲-سنگدل شهزادي-

۳۳-افريقا جي شهزادي-۳۴- شيواجي شيش محل-

۳۵۔چین جو چنڊ۔۳٦۔قسطینه جي شهزادي۔

۳۷۔ جنگ ترک و جرمن۔۳۸۔فتح بیت المقدس۔

۳۹۔ انقلاب سنڌ عرف فتح پاکستان۔۴۰۔ احمد شاھ ابدالي

۴۱۔افضل شهيد۔۴۲۔ مينا بازار۔۴۳۔ ڊاهري رنگ محل۔

۴۴۔سبکتگین ۽ جي ٻال۔۴۵۔ فتح يرموک۔

۴٦۔بلبل ايران۔۴٦۔کاشي جا ٻاڙ

(ب) قومی آزادی کے موضوعاتی ناول

۱۔۱۸۵۷ع جي آزادي جي جنگ۔۲۔شير ايران۔۳۔غازي مصطفيٰ کمال

۴۔سمرقند جو صوف۔۵۔مجاهد کشمیر۔٦۔انقلاب مصر۔

۷۔کوريا جي کنوار۔۸۔سوڊان جي سونهن۔

دو ناول زلف چین اور مصری جاسوس روز نامہ 'عبرت' میں شامل اشاعت ہوتے رہے مگر کتابی صورت میں شائع نہ ہو سکے۔

کچھ ایسے ناول بھی ہیں جو نامکمل رہے تاہم قسط وار روز نامہ 'روز نامہ عبرت' میں دلچسپی سے پڑھے گئے مثلاً ۱۔کلي جون محفلون (محمود غزنوی کا ملتان پر حملہ) ۲۔علامہ ابن رشد کی زندگی پر ایک ناول "جي کاک نه جهليا کاهڙي" جس کی قسطیں ہفت روزہ 'انسان' میں شائع ہوئیں۔

(ج) غیر ملکی ناولوں کے سندھی تراجم

اس سلسلے میں روسی ناول نگار گورکی، اوستروسکی اور کئی دوسرے مشاہیر کے ناولوں کے تراجم اور تخلیصیں ڈیپلائی صاحب نے بڑی عمدگی سے پیش کیں۔

(د) ڈیپلائی صاحب کے تصنیف کردہ ڈرامے

ناول نگاری کی طرح ڈرامہ نویسی میں بھی موصوف کو بڑا کمال حاصل تھا ان کے ڈرامے اسٹیج اور برقی ذرائع ابلاغ سے بھی شائقین تک پہنچے اور مقبول ہوئے مثلاً:

۱۔غیرت عرف نورجهان جو ہٹ۔۲۔کانگریسي نانک۔

۳۔کانگریسي جار۔۴۔نجومي۔۵۔اسلام تي مقدمو۔

۶۔سجائي موڙي۔۷۔شاهدي۔۸۔ڏکار۔۹۔واپڙو۔

۱۰۔کورٹ نانک۔۱۱۔ڊاکٽر۔۱۲۔آزاد چونڊون۔

۱۳۔پنجائتي پدمني۔۱۴۔بي وقتي بانگ۔۱۵۔مرزا جاني بيگ

(ر) افسانے اورافسانوں کے مجموعے

۱۔ضمير جو خوابانيون(مجموعہ)۲۔رنگارنگي دنيا(مجموعہ)

۳۔ شان مسلم۔۴۔درگاهه شريف۵۔بغداد جو ڏاڙهل

۶۔مجاهدان اسلام(مجموعہ)۷۔گلشن عبرت(مجموعہ)

۸۔اسپيني شهزادو۹۔اسپيشل امام۱۰۔اقبال جي پيڙ

۱۱۔اکيلو منارو۱۲۔اوليائن جي مار ۱۳۔اورنگزيب جو انصاف

۱۴-ٻاٻر جو قاتل-۱۵-ٻزدل نورجهان-۱۶-ٻارس۱۷-ٻنج گڏيون

۱۸-ٻوڙهو اُٺ-۱۹-ٻلي ولايت-۲۰-تپيدار جي رپوٽ (ترجمہ)

۲۱- جيل جو تيل-۲۲-جيل جو ڊاڪٽر-۲۳-جوڙي (ترجمہ)

۲۴- حضرت خالدؓ جو روضو۲۵-چنبڙ جو تيل-۲۶-حق جو رعب

۲۷-سائنس جو ڀت۲۸-علماء حق جوشان۲۹-دکن جو غدار

۳۰-غدار جي عزت-۳۱-شرڪ ناس(مجموعہ)۳۲-قلندر جو هندورو

۳۳-ڪاڪوس هڙتال ۳۴-مرشد جواُٺ۳۵-مرشد جو ٻڪر

۳۶-مرشد جون ٽنگون(مجموعہ)۳۷-مرشد جو حج

۳۸-مرشد جو گهوڙو(مجموعہ)۳۹-مرشد جي ڏي(مجموعہ)

۴۰-مرشد جي ڏاڙهي(مجموعہ)۴۱-مصري عامل ۴۲-معصوم مجاهد

۴۳-نانگي شاهه جو ڪنڊو۴۴-نقارن جو قيدي۴۵-هلر(ترجمہ)

۴۶-وڏيري جي رات۴۷-نيت جو ڦل۴۸-نر ۽ ماديءَ جو فرق

۴۹-دل ۾ لٿل درد۵۰- آخري سبق(مجموعہ)

۵۱-راجہ هري سنگھ جو دربار ۵۲-بهادر مسلمان۵۳- اڦيم جوجبل-

۵۴- مظلوم مهاجر(ترجمہ) ۵۵- شير مار شيدي(ترجمہ)

۵۶- مسلمان بادشاهه(مجموعہ)۵۷-دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو

۵۸- مصطفيٰ ﷺ جوقيدي-۵۹-شريف ڪمانڊر-

۵۹-سيد جو اٺ-۶۰-ٻٽ جي قيمت

(س) تاریخ

ڈیپلائی صاحب کوتاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔سندھی قارئین کواسلامی اور عالمی تاریخ سے متعارف کرنے کے لیےانہوں نے تاریخی موضوعات کوآسان اوردلچسپ انداز میں پیش کیا جیسا کہ ان کے ناولوں ،ڈراموں اورافسانوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ان کی تصانیف میں درج ذیل کتابیں علم تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔

ا۔ انسان جي تاريخ ۲۔هند وستان جي سچي تاريخ

۳۔دنيا جي تاريخ ۴۔ فتوحات اسلام

۵۔هندوستان جي اسلامي تاريخ ۶۔سرفرشان اسلام

۷۔لال جهنڊو ۸۔تاريخ بهادران اسلام

(ص) تنقید

ڈیپلائی صاحب کی زیادہ تر تصانیف تخلیقی ادب کے دائرے میں آتی ہیں تاہم ان کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیت بھی بڑی اہمیت کی حامل رہی۔تحقیق کا اندازہ تو تاریخ پر لکھی گئی کتابوں سے ہوسکتا ہے البتہ چند تصانیف ایسی بھی ہیں جوتنقیدی ادب کا حصہ ہیں مثلاً 'بقول ایاز' میں انہوں نے شیخ ایاز کے افکار ونظریات اورشعروادب کا جائزہ پیش کیا ہے۔

(ط) لطیفیات

ڈیپلائی صاحب کوحضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی مثالی شخصیت اوراُن کے عارفانہ کلام یعنی 'شاہ جورسالو' سے عشق تھا۔'رسالو' کے الفاظ ومعانی کا فہم وادراک جوموصوف کوتھااس کی واضح مثال ان کے مرتب کردہ 'شاہ جورسالو' کے نسخے سے مل جاتی ہے۔جس کا پاکٹ ایڈیشن بھی انہوں

نے ترتیب دیا تھا۔ علاوہ ازیں شاہ سائیں کے کلام و پیام کی تفہیم کے لیے بھی انہوں نے مضامین لکھے وہ بڑے پُر مغز اور معلوماتی ہیں۔اس سلسلے میں ان کی تصنیف کردہ ایک کتاب' کے رسالہ کا رہبر' کے نام سے موسوم ہے اور اس کی کیفیت کچھ درج ذیل شعر جیسی ہے ؎

یوں جلوہ گر ہے کوئی پسِ پردۂ خیال
بادل میں جیسے کٹتی ہوئی چاندنی ملے

(م) دینی کتب

ڈیپلائی صاحب کو اولیں دورِ تصنیف میں دینیات سے گہرا لگاؤ رہا چنانچہ وہ جماعتِ اسلا سے خاصے متاثر رہے بعد میں جماعت سے تو تعلق نہ رہا البتہ دینی بصیرت قائم رہی۔اس۔ اچھی خاصی تعداد میں دینی کتابوں کی تالیف واشاعت ہوتی رہی۔مثلاً قران شریف۔ سنڌي ترجمو ترجمہ،قراني دعائون،قراني خزانو،صداقت القران،مطالب القراد ارشادالقران،تعليم القران۔انھوں نے مولانا مودودی کی کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ج میں قراني دعائون' 'اسلامي حكومت' 'اسلام جو سياسي نظريو' 'قراذ خزانو' 'صداقت قران' 'مطالب القران' 'ارشادالقران' 'تعليم القران' 'سلامت جورستو' 'اسلام ۽ ايمان' 'كلمي پاڪ جي حقيقت' 'جهاد جي حقيقت' 'ح جي حقيقت' 'حقيقت اسلام' 'حقيقت قادياني' 'روزي جي حقيقت' 'دين جم حقيقت' 'سچوايمان' 'عبادتون' 'كلمو پاڪ ۽ مسلمان ٿيڻ جي لاءِ علم جم ضرورت' 'مسلمان عورت ۽ نماز جي حقيقت' وغیرہ شامل ہیں۔

ڈیپلائی صاحب نے اکابران اسلام کی شخصیات اور اہم واقعات پر بھی قابلِ قدر تصانیف پیش کیں جیسے کہ:

سیرت محمدیؐ، سیرت الرسولؐ، سیرت حیدرؓ، سیرت الصدیقؓ، سیرت الفاروقؓ، سیرت عثمانؓ، شاد الخلفاء، سیرت الفاطمہؓ، شہید کربلا، سیرت امام حسینؓ، شاہ جیلانی اور محمد بن عبدالوہاب۔
حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے زود نویس اور ہمہ جہت صاحب علم و دانش تھے۔ وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ حافظہ بھی بہت اچھا تھا۔ انہوں نے علوم جدیدہ پر بھی نظر ڈالی مثلاً علم نفسیات پر تین کتابیں ترجمے کی صورت میں ہیں یعنی روشن زندگی، راحت بھری زندگی اور بہتر زندگی۔
علم لسانیات کی جانب بھی ان کی توجہ رہی۔ 'سندھی استاذ اور' اردو استاذ' لسانی ضروریات کے متعلق ہیں۔
ڈیپلائی صاحب کی تصانیف اور تحریر کردہ مضامین کا کچھ حصہ قید و بند اور کتابوں کی بندش کے زمانے میں ضائع بھی ہوگیا تاہم جتنا ذخیرہ بھی ان کے ذی علم اور بذات خود صاحب قلم فرزند ارجمند محمد علی ڈیپلائی متعلقہ ٹرسٹ کے لیے محفوظ رکھ سکے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تصانیف کی اتنی کثیر تعداد ان کی ادبی خدمات کا لائق تحسین ثبوت ہے۔

(ن) تبصرے اور جائزے

ماہنامہ "نئین زندگی" حیدرآباد۔ کراچی

o	سندھی ادب کے قدیم اشاعت گھر	اکتوبر ۱۹۶۱ء
o	ایضاً	دسمبر ۱۹۶۱ء
o	ایضاً	اپریل ۱۹۶۲
o	ایضاً	جون ۱۹۶۲ء
o	سندھی ادب کے قدیم اشاعت گھر	اکتوبر ۱۹۶۲ء
o	پاکستان کی تعمیر	اگست ۱۹۶۷ء

نوٹ: ماہنامہ "نئین زندگی" کے بلند پایہ ایڈیٹر مولانا عبدالواحد سندھی ہوا کرتے تھے

اور یہ ماہنامہ کراچی سے ادارۂ مطبوعات پاکستان کے زیرِ اہتمام شائع ہوتا تھا بعد میں سندھ جاری رہا۔

(و) سه ماهي 'مهران' میں ڈیپلائی صاحب کی نگارشات

- تاریخ ریگستان از رائے چندر راٹھور (تبصرہ) شمارہ ا۔ ۱۹۵۶ء
- جهان آرا ــــ از عبدالرزاق عبدالسلام (تبصرہ) " ۱۹۵۶ء
- آفتاب ادب ــــ از حکیم فتح محمد سیوہانی (تبصرہ) " ۱۹۵۶ء
- بلوکوکر ــــ از صاحب سنگھ شاہانی (تبصرہ) " ۱۹۵۶ء
- خوش خصلت خاتون ــــ از بیگم باادام ناتواں (تبصرہ) ۱۹۵۶ء
- سڏارٿ ــــ از پروفیسر ایسرداس (تبصرہ) " ۱۹۵۶ء
- سنڌ جو سينگار ــــ از عبدالکریم سندیلو (تبصرہ) " ۱۹۵۶ء
- عشق نہ آھي راند ــــ " " (تبصرہ) ۱۹۵۶ء
- ڪامل جو ڪلام ــــ از جھمٹ مل بھاونانی (تبصرہ) " ۱۹۵۶ء
- ڪنول ڪلي ــــ ادارۂ انسانیت حیدرآباد (تبصرہ) ۱۹۵۶ء
- گل ڦل ــــ از پرمانند میوارام (تبصرہ) " ۱۹۵۶ء

یہ تبصرے ڈیپلائی صاحب کے تنقیدی شعور کو ظاہر کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہی تبصرے ۱۹۵۶ء میں شائع ہونے والے شمارہ ۲ کی زینت بنے ہیں۔ زیادہ تر تبصرے سندھی اہلِ قلم کی تصانیف: مثلاً ۔موجوده سياسي مسئلا، چمڪندڙ زندگي ، سنڌ جو سفر، راسيلاس سنڌي ٻولي جي تاريخ ،شاه جا گم ٿيل بيت ، راحت ڀري زندگي وغیرہ۔

جن اہل قلم کی تصانیف زیر تبصرہ آئیں ان کے اسمائے گرامی میں عبدالرحیم جونیجو، ہری رام مازی والا، جی ایم سید، شوقی رام اڈوانی، قادر بخش نظامانی، بھیرومل مہرچند آڈوانی، لال چند امرڈومل، شیخ محمد سومار اور شرت چندر چٹر جی شامل ہیں۔ تیسرے شمارے میں گوبند مالھی، کیول رام سلامت رائے، مولوی ہدایت اللہ مشتاق، رسول بخش خمار، نارائن داس بلیجا، ڈاکٹر ٹلومل، سید غلام مصطفیٰ شاہ کی تصانیف پر تبصرے ہیں۔ ان تصانیف میں چند قابل قدر کے موضوعات درج ذیل ہیں۔

- مثنوي مولانا روم جو سنڌي ترجمو
- مهراڻ جون موجون
- ايسپ جون آکاڻيون
- مرزا قلیچ بیگ کا ڈرامہ 'خورشید'
- جناب سید غلام مرتضیٰ شاہ سنائی سہ ماهي مهراڻ۔ شمارہ ۳۔۴۔ ۱۹۵۷ء
- آنجہانی ڈاکٹر ٹلومل (تبصرہ) سہ ماهي مهراڻ (عمومی شمارہ) ۲۔۳ ۱۹۶۱ء
- اسلام جا عطا ڪيل بنيادي انساني حق خطبۂ حجۃ الوداع۔ جائزہ (ڈیپلائی صاحب کا یہ اہم مضمون ہے) شمارہ ۳۔۴۔ ۱۹۸۰ء

(ہ) ہفت روزہ 'انسان' حیدرآباد کے خاص نمبر

ڈیپلائی صاحب کے صحافتی کارناموں میں ایک قابل قدر کارنامہ 'انسان' (جو فیض احمد فیض کے مشوروں کے روشنی میں جاری ہوا) کا اجراء ہے، جسے قارئین میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے چند خاص نمبروں کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

- شہید انسانیت (ابراہیم لنکن) نمبر ____ ۳رمئی ۱۹۵۹
- جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) نمبر ____ ۱۱رمئی ۱۹۵۹

○ شہیدانِ کربلا کی یاد میں (محرم نمبر) ___ ۱۳۔۲۰ جولائی ۱۹۵۹

○ شہزادہ کریم آغا نمبر ___ ۲۷ر جولائی ۱۹۵۹

○ آزادی اور بھٹائی نمبر ___ ۱۷ر اگست ۱۹۵۹

○ قائداعظم نمبر ___ ۲۰ر دسمبر ۱۹۵۹

○ شاہ لطیف نمبر ___ ۸ر اگست ۱۹۶۰

○ عید میلاد النبی نمبر ___ ۵ر ستمبر ۱۹۶۰

○ ٹالسٹائی نمبر ___ ۱۲ر دسمبر ۱۹۶۰

○ قائداعظم نمبر ___ ۲۶ر دسمبر ۱۹۶۰

○ سچل سرمست نمبر ___ ۲۷ر فروری ۱۹۶۰

(ء) جیل کے مشاہدات

ڈیپلائی صاحب اپنی بے باک اور جرأت آموز تحریروں کے سبب مختلف اوقات میں (۱۹۵۸ء، ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۶ء) قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے لیکن وہ سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کی طرح کبھی بھی طاغوتی قوتوں سے کوئی سمجھوتہ کرنے پر راضی نہ ہوئے بلکہ ثابت قدمی اور صبر و ایثار سے ناساعدہ حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔

تین مرتبہ کی 'جیل یاترا' کے دوران جو مشاہدات اور عملی تجربات حاصل ہوئے ان کا اظہار انہوں نے متعدد مضامین اور افسانوں میں کیا جن کا احوال وہ اپنے ہفت روزہ 'انسان' کی اشاعتوں میں بھی پیش کرتے رہے۔

○ جیل جو تیل (جیل کے مشاہدات) شمارہ ۱۸ مئی ۱۸۵۹ء

○ جیل جو پڑہون " شمارہ یکم جون ۱۹۵۹ء

○ کاکوس هڑتال " شمارہ یکم جون ۱۹۵۹ء

○ جيل جو ڊاڪٽر ... شمارہ ۶ر جولائی ۱۹۵۹ء

○ ڏکي ڪ گڏهه ... شمارہ ۱۳-۲۰ جولائی ۱۹۵۹ء

○ نئون ڳالهيو (نئی گنتی) ... شمارہ ۲۷ر جولائی ۱۹۵۹ء

○ جيل جو جمعو (جیل کا جمعہ) ... ۷ر اگست ۱۹۵۹ء

○ اٺ پوڙهو ٿيو ته به... (اونٹ بوڑھا ہوا تو بھی) شمارہ ۱۴ر ستمبر ۱۹۵۹ء

○ گجهه (گِدھ) ... شمارہ ۱۶ نومبر ۱۹۵۹ء

ڈیپلائی صاحب نے تین مرتبہ کی قید کے دوران بھی اپنا قلمی جہاد جاری رکھا جس کی ایک جھلک مندرجہ بالا سطور میں پیش کی گئی۔ ان کے جریدے یعنی ہفت روزہ 'انسان' میں شائع ہونے والی تحریروں کے علاوہ چند ایسے افسانے بھی ہیں جو ماهي سهراڻ اور کئی دوسرے جریدوں میں شائع ہوئے۔ 'مهربان خوني' اور 'اسپيشل امام' جیسے افسانے اسی زمرے میں آتے ہیں۔

ہفت روزہ 'انسان' کے اداریے بھی بڑے زوردار ہوتے تھے جن میں سے کچھ یادگار اداریے درج ذیل ہیں:-

○ انسان امر ہے ______________ ۱۴ر ستمبر ۱۹۵۸

○ نیا جمہوری حق ______________ ۲۹ر جون ۱۹۵۹

○ لومبا کی شہادت ______________ ۲۰ر فروری ۱۹۶۰

○ مسٹر کھوڑو کی آزادگی ______________ ۷ر مارچ ۱۹۶۰

○ ایک ہیبت ناک انکشاف ________

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے بیان دیا تھا کہ تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے روبعمل آنے سے سندھی زبان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس بیان کے جواب میں یہ اداریہ لکھا گیا ۹ر مئی ۱۹۶۰ء

○ سندھ کی فریادیں ______________ ۸ر اگست ۱۹۶۰ء

(ی) شاعری

ڈیپلائی صاحب نے شعروشاعری کا ذوق وشوق بھی ابتدائی دور میں اپنایا اور 'شائق' تخلص بھی اختیار کیا لیکن نثری نگارشات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور شاعری کا جو ہر جوان میں موجود تھا وہ بھرپور انداز سے اُجاگر نہ ہوسکا۔

سندھی زبان وادب کا ممتاز جریدہ سہ ماہی 'مہراڻ' جو اس لحاظ سے بھی دستاویزی نوعیت رکھتا ہے کہ اس کے خصوصی شمارے اب سندھی شعروادب کی تاریخ میں مثالی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں تیسرا شمارہ اس جریدے کا 'شاعر نمبر' کے طور پر شائع ہوا تھا۔

اس خاص نمبر میں محمد عثمان ڈیپلائی 'شائق' کی شعری تخلیقات اور بذات خود ان کا تحریر کردہ تعارف شامل اشاعت ہے۔ مولانا غلام محمد گرامی ان دنوں 'مہراڻ' کے ایڈیٹر تھے۔ ڈیپلائی صاحب نے اپنے تعارف میں تحریر کیا ہے کہ "اسکول کے زمانہ طالب علمی میں اپنے دوست قاضی علی محمد سے شاعری کا مرض مجھے بھی لگ گیا، کسی اُستاد کی جانب رجوع ہوا تو آزاد شعر کہنے کی بجائے اول اول کسی دوسرے شاعر کے کلام پر تضمینوں کا سلسلہ شروع کیا اور اس کے تتبع میں شعر کہے پھر آگے چل کر اپنے طور پر کچا پکا کلام موزوں کرنے لگا۔"

ڈیپلائی صاحب نے کُھلے دل سے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ان دنوں بحر ووزن اور ردیف و قافیہ کی خبر نہیں تھی بس ایک فطری اپج کی بدولت شاعری کا شوق آگے بڑھتا رہا۔ فرماتے ہیں" زیادہ تو مجھے بھی یاد نہیں ہاں ایک بند یاد آرہا ہے"۔

جس بند کا موصوف نے حوالہ دیا ہے وہ تین ہم قافیہ مصرعوں پر مشتمل ہے، جن کا مجموعی مفہوم کچھ یوں ہے کہ " باطنی طور پر مجھے آرام نہیں ہے اور دل اس دنیا سے نہیں لگتا کیونکہ جدائی کی آگ میں جل رہا ہوں بھلا آرام وسکوں کا کیا آسرا ہو، اے محبوب تیری آرائش وجمال آج مجھے شدت سے تڑپا رہی ہے۔"

اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوانی میں حسن ومحبت کی جو کیفیات دلوں پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں، ڈیپلائی صاحب کے جذبوں میں بھی شاعرانہ اظہار کی ویسی ہی رومانی لہر ہے۔ مثال کے طور پر مذکورہ بند کا پہلا مصرعہ ہی اس کرب کو ظاہر کر رہا ہے۔

"اندر ہر آرام ناهي ، دل نه دنيا سان لڳي"

اپنی شاعری کے اس ابتدائی مرحلے اور بعد کی پیش رفت کے بارے میں ڈیپلائی صاحب نے بیان کیا ہے کہ "بس یہی اوائلی کلاسیکی شاعری تھی جس کے بعد میں نے اپنا تخلص شائق رکھا اور معلوم نہیں میرے دوست نے کون سا تخلص رکھا پر جیسے تیسے شعر وہ آج تک کہہ رہے ہیں۔"

اس بیان کے تسلسل میں ڈیپلائی صاحب نے جو اشعار رقم کئے اور جو مطبوعہ صورت میں 'مہران' کے شاعر نمبر کی زینت ہے وہ دو غزلوں پر مشتمل ہیں۔ جن کا نفس مضمون پیش کرنے سے پہلے دونوں غزلوں کی ایک جھلک انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔(۱)

مطلع اول۔

نڪتي آهه دل مان ، آڪين آب هاريو
پيو وقت سو ياد، جو گڏ گذاريو

اس غزل کا مقطع۔

ڪري ڪو ڪرم، ڪرسچن شاد 'شائق'
پري پرنٽون، جڏو جي ء جياريو

دوسری غزل کا مطلع۔

سڻايو صبا تنهنجو پيغام مون کي
چڪيا چاڪ تازو ٿيو آرام مون کي

مقطع ہے

صبر 'شائقا'، سوز کي سائد دل ہم

نہ قادر کند و نیت ناکام مون کي

نفس مضمون دونوں غزلوں کا کچھ ویسا ہی ہے جیسا کہ ہم اردو غزلوں میں عموماً عشق، عاشق کے روایتی اشعار میں دیکھتے ہیں۔ چاہنے اور چاہے جانے میں مقامات آہ وفغاں بھی آتے ہیں وصل، ملن اور محبوب کا قرب جو سرشاری دیتا ہے پھر عالم فراق میں جب وہ پُرکیف لمحے یاد آتے ہیں تو عاشق ناشاد کے دل سے آہ نکلتی ہے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ ہجر کی کربناکیاں تن من میں سوز دروں کو ہوا دیتی ہیں۔ وفاداری کا تقاضا بھی یہی ہوتا ہے کہ محبوب کی جدائی برسوں بے چین رکھے۔ بس یہی خیال اور یہی جذبہ بیقرار دل کو سہارا دیتا ہے کہ جدا ہونے والے محبوب سے قُرب کی سرخوشی پھر حاصل ہوگی اور دل جی اُٹھے گا۔ پہلی غزل میں شائق اسی خیال سے چشم کرم کا منتظر ہے۔

دوسری غزل میں صبا عاشق مہجور کو محبوب کا پیغامِ محبت دیتی ہے اور اس پیغام سے عاشق رنجور تازہ دم ہو جاتا ہے لیکن جدائی کا احساس یادوں کو بیقرار رکھتا ہے۔ بغیر محبوب کے جینا آزار جاں بنا رہتا ہے۔ عاشقی میں خود سپردگی اور بیخودی کچھ ایسے مرحلوں سے بھی دوچار کرتی ہے کہ خواہش وصل کے آگے سب کچھ ہیچ نظر آتا ہے مگر آخر کار صبر وشکیب کا وہ لمحہ بھی آتا ہے کہ قادر مطلق سے لو لگاتے ہوئے یہ طمانیت قلب محسوس ہوتی ہے کہ وہ کریم و کارساز نامرادی دور کرکے ناکامی کو کامیابی سے ہمکنار کردے گا۔

ڈیپلائی صاحب نے اپنے اشعار کو کچے اشعار پر محمول کیا ہے بقول ان کے" پھر ایسے کچے اشعار اپنی نوٹ بک میں لکھ لیتا تھا، وہ نوٹ بک ایک ساتھی چُرا لے گیا جس کا مجھے کوئی غم نہیں کیونکہ ایسے اشعار پڑھنے کا شوق جوانی ہی میں پورا ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ نوٹ بک یا بیاض کہاں ہوگی؟ اس کے بعد جب میں نے کتابی سلسلہ شروع کیا تب اپنے ناٹکوں اور ڈراموں کے

لیے نظمیں لکھیں جن کو پڑھ کر محمد خان 'غنی' صاحب نے یہ مشورہ دیا کہ یہ شوق چھوڑ دو۔"

ڈیپلائی صاحب کے فرزندِ ارجمند جناب محمد علی ڈیپلائی نے ناٹکوں اور ڈراموں کے لیے لکھی جانے والی وہ چار نظمیں دریافت کر لیں ہیں جو روزنامہ "عبرت" حیدرآباد میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۶ء کے درمیانی عرصے کے دوران شامل اشاعت ہوئیں۔ ان میں سے ایک نظم اس وقت کے صدر میجر جنرل اسکندر مرزا کی بیگم ناہید اسکندر مرزا کے اس بیان پر کہی گئی تھی کہ "پاکستان میں اسلام جاری کیا جائے گا"۔ نظم کا عنوان تھا 'اسلام چالو ہوتا ہے'۔

اسی زمانے میں امریکہ کو پاکستان کی سرزمین پر فوجی اڈے قائم کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں اور یہ بھی سنا گیا تھا کہ بولھاڑی اسٹیشن کے قریب دوسری عالمی جنگ کے دوران برطانوی حکومت نے جو عارضی ہوائی اڈہ بنایا تھا اس کی بھی نئے سرے سے تعمیر ہو رہی ہے تاکہ اسے بنا سنوار کے امریکہ کے حوالے کیا جا سکے۔

اس موقعہ پر بھی ڈیپلائی صاحب نے ایک طویل طنزیہ نظم کہی تھی جس کی ابتدائی سطریں یوں ہیں:

"اسان جادل گھریا مهمان ڀلي آيا ، ڀلي آيا"

یعنی ہمارے محبوب مہمان آئے ہیں خوش آمدید، خوش آمدید

یقیناً ڈیپلائی صاحب شاعری پر اگر بھرپور توجہ دیتے تو ایک دو شعری مجموعے بھی ضرور شائع ہوتے مگر ناگزیر وجوہ اور اس دور کے سماجی حالات نے جو اصلاحی جذبہ ان کے فکر و عمل میں بیدار کیا اس کا اظہار افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں انھوں نے بڑے بھرپور انداز میں کیا ہے جو شاعری میں ممکن نہ تھا۔

راقم الحروف نے اس سلسلے میں جب یہ سوال کیا تھا کہ "آپ نے شاعری کا ذوق و شوق رکھنے کے باوجود زیادہ سے زیادہ نثری تخلیقات اور صحافیانہ تحریروں پر توجہ صرف کی اس کا کیا جواز ہے؟"

انھوں نے جواباً فرمایا "شعوری طور پر جب مجھے یہ احساس ہو گیا کہ نثری اظہار میں وہ باتیں جو عوامی سطح پر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں، زیادہ اثر انگیزی کے ساتھ پہنچ رہی ہیں تو شاعری پیچھے رہ گئی۔"

(ے) چاند کا داغ

(اولین دور کے ایک سندھی افسانے کا اُردو ترجمہ)

''تو میرے دوست! ایک بار پھر مابدولت کے قیام و طعام اور دیگر اخراجات کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی ہے۔'' اداکاری کرتے ہوئے اسلم نے کہا

''سر آنکھوں پر۔ لیکن حضور! خیریت تو ہے؟ ہوا کیا ہے آخر؟'' اشرف نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے اسلم سے پوچھا

''نوکری سے جواب'' اس نے بیزاری سے جواب دیا

''لیکن کیوں بھئی! تم تو اچھے خاصے شریف اور محنتی قسم کے ملازم ہو اور پھر سونے پر سہاگہ کہ وقت کے بھی پابند۔ پھر نوکری سے جواب کیوں؟''

اشرف نے فکرمند لہجے میں سوال کیا

''بس گھبرا گئے نا بچو! آخر کب تک میرا خرچ برداشت کرتے؟'' طنز کرتے ہوئے اسلم نے جواب دیا۔

''یار! پاگل تو نہیں ہو گئے؟ تم سے بھلا میں تنگ آسکتا ہوں؟'' تڑپ کر اشرف نے کہا اور اسے گلے لگا کر پوچھا:

''کیا تم اور میں الگ الگ ہیں؟ تم میرے لیے اس طرح سوچ سکتے ہو؟''

''میں! لیکن یار! میرے ایسے نصیب کہاں؟'' اسلم نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا ''ورنہ میں تمہاری خاطر تو جان تک قربان کرسکتا ہوں۔''

''پھر مجھ سے یہ بدگمانی کیوں؟'' اشرف نے سوال کیا

''اے بندۂ خدا! میں تو مذاق کر رہا تھا'' اسلم نے بات کو ٹالنا چاہا۔

''جی جناب! آپ کریں مذاق اور ہم جائیں جان سے۔ خیر چھوڑیں اور اب آپ یہ فرمائیں

نوکری کیسے گئی؟''

''اے یار! نوکری بھلا کہاں جائے گی؟ جا تو ہم رہے ہیں استعفیٰ دے کر'' قہقہہ مارتے ہوئے اسلم نے کہا

لیکن کیوں؟ آخر وجہ کیا ہے استعفیٰ دینے کی کچھ بتاؤ بھی'' اشرف کے لہجے میں تشویش تھی۔

''پیارے! وجہ میری طرف سے تو کچھ بھی نہیں ہے لیکن تم جانتے ہو کہ آج اتوار تھا'' اسلم بڑے اطمینان سے بولا۔

''تھا نہیں بلکہ ہے'' اشرف نے اسے ٹوکا اور سوال کیا'' لیکن اگر اتوار ہے تو پھر کیا ہوا؟''

''ارے یار! یو چھو کہ کیا نہیں ہوا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے راستے میں سالے صاحب مل گئے جو اصرار کر کے اپنے گھر لے گئے اور پھر وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔'' ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اسلم نے کہا

''یعنی تم نے ہماری ہونے والی بھابھی کا چہرہ دیکھ لیا'' ہنسی ضبط کرتے ہوئے اشرف نے پوچھا اور پھر خود ہی بڑے ناصحانہ انداز میں سمجھایا

''ارے بدھو! لوگ تو محبوب کا دیدار کر کے جیتے ہیں اور ایک تم ہو کہ جب بھی اسے دیکھ لیتے ہو پھر کوئی بات بھی مرضی کے خلاف ہو تو اس بیچاری کو ذمہ دار سمجھ لیتے ہو۔ بھلا تمہاری نوکری کا اس سے کیا تعلق؟''

''یار بڑا تعلق ہے ...... جب بھی ان محترمہ کو دیکھ لوں، سمجھو نوکری ختم۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ منگیتر صاحبہ ہمارے لیے منحوس ہیں...... بنے بنائے نصیب بگڑ جاتے ہیں انھیں دیکھنے کے بعد۔''

''دوست! یہ سب وہم ہے تمہارا۔ ارے پگلے! ایسی خوبرو منگیتر کو دیکھ کر تو بگڑے کام بھی بن جاتے ہیں۔ لوگ چاند سے چہرے کی جھلک دیکھنے کو ترستے ہیں اور دیکھ کر جیتے ہیں۔ لیکن نہ جانے تمھیں کیوں وہم ہو گیا ہے بلاوجہ!''

''یار! جیتا تو میں بھی اپنے چاند کو دیکھ کر ہی ہوں۔ بھلا ایسے چاند سے مکھڑے کو دیکھ کر کون کم

بخت خوش نہ ہوگا لیکن کیا کیا جائے ہمارے چاند میں تو ہیں داغ اور وہ داغ ہمارے نصیب کے گرہن بن جاتے ہیں۔"

"لیکن دوست! یہ تمہارا وہم بھی تو ہو سکتا ہے یا محض اتفاق، ضروری تو نہیں کہ بھابھی کے نظر آنے کی وجہ نوکری چھوٹنے کا سبب بنتی ہو۔"

"وہم کیسا؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ جب بھی اسے دیکھ لیتا ہوں تو جان پر تو بن ہی جاتی ہے لیکن نوکری کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں۔ افسران سے اَن بَن...... یا دفتر سے ملازموں کی چھانٹی...... بہر حال کچھ بھی ہو بُد حولوٹ کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو...... اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے، اس سے پہلے کہ آفس والے نوکری سے جواب دیں میں ہی کیوں نہ استعفیٰ دے دوں عزت کے ساتھ۔"

اسلم نے فیصلہ کن انداز سے یہ بات کہی تو اشرف کو کچھ کہنے کی گنجائش ہی نظر نہ آئی۔

دونوں بچپن کے دوست تھے۔ حالات نے انہیں ہمیشہ ساتھ رہنے کے مواقع فراہم کئے۔ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر انھیں پل بھر چین نہ آتا لیکن جب اشرف کا ٹرانسفر دوسرے شہر میں ہوا تو اسلم بھی اس کے ساتھ چلا آیا اور مختلف پرائیویٹ دفاتر میں کام کرنے لگا۔

یہ بھی محض اتفاق تھا کہ اسلم کی سسرال بھی اسی شہر میں تھی اس لیے وہ برادرانِ نسبتی کے اصرار پر وہاں جاتا تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی کہ جب بھی منگیتر کا دیدار ہوتا، ہفتے عشرے میں نوکری سے جواب مل جاتا یا کسی نہ کسی وجہ سے نوکری جاتی رہتی، لیکن منگیتر اتنی حسین تھی کہ اسے دیکھے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔

دو ایک مرتبہ ٹالنے کے بعد بہر حال دل پر قابو نہ رہتا اور چاند چہرے کی ایک جھلک دیکھ ہی لیتا اور نتیجہ یہ نکلتا کہ نوکری سے ہاتھ دھونا پڑتے۔

بے روزگاری کے دنوں میں اشرف ہی سارے اخراجات پورے کرتا اور بڑی خوش اسلوبی سے دوستی کا بھرم رکھتا بس یوں سمجھ لیجئے کہ وہ تقریباً عادی ہو گیا تھا۔

آج صبح بھی اسلم اپنی منگیتر کا دیدار کر کے آیا تھا اور اسے یقین تھا کہ نوکری گئی بس اس لیے فیصلہ کرلیا تھا کہ بہتر ہے استعفیٰ دے دیا جائے حالانکہ اشرف نے اسے بہت سمجھایا لیکن اسلم کی ایک ہی رٹ تھی کہ آزمائے کو کیا آزمانا۔ بے عزتی کی برطرفی سے تو بہتر ہے کہ عزت سے استعفیٰ دے دیا جائے۔

اشرف نے لاکھ سمجھایا کہ نوکری کا منگیتر کی صورت دیکھنے سے کیا تعلق ہے یہ تو فضول سا وہم ہے لیکن اسلم کا بس یہی جواب تھا کہ "میں تمہاری مانوں یا اپنے تجربات کو دیکھوں۔"

دفتر جا کر اسلم نے پہلا کام یہی کیا کہ استعفیٰ لکھ کر صاحب کو بھجوا دیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا ۔اسے یقین تھا کہ اب بلاوا آیا "میاں! اچھا کیا ہم تو خود بھی تمہیں چھوڑنے کی فکر میں تھے" ۔اور پھر واقعی چپڑاسی، صاحب کا بلاوا لے کر آن پہنچا۔

بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ اسلم صاحب کے کمرے میں گیا۔اب اسے کوئی خوف اور کوئی اندیشہ یا فکر نہ تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ صاحب کیا کریں گے۔

پیشی ہوئی تو صاحب نے بیٹھنے کو کہا اور بالکل ہی غیر متوقع طور پر کہنے لگے "مجھے افسوس ہے مسٹر اسلم، ہم نے تمہاری زبان کھلوائی ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ تمہاری محنت، شرافت اور پابندیٔ وقت کی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں خود ہی احساس تھا کہ تنخواہ بڑھا دینی چاہیے لیکن خیــــر دیـــــر آید درســـت آید ۔ہم تمہاری محنت سے بہت متاثر ہیں اور فوری طور پر تنخواہ میں ڈیڑھ سو روپے کا اضافہ کر رہے ہیں۔امید ہے کہ تم وقت کے ساتھ آئندہ بھی اپنی محنت کی بدولت ترقی کرتے رہو گے۔"

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسلم تنخواہ بڑھنے کا سن کر خوش ہوتا لیکن اس کے ذہن پر تو نوکری سے برطرفی کا بھوت سوار تھا۔اس لیے کہنے لگا "جناب والا! یہ بات نہیں......"

"میں جانتا ہوں کیا بات ہے" اسلم کی گفتگو کاٹ کر صاحب نے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر ڈیڑھ سو کم ہیں تو ہم ڈھائی سو تک اضافہ کردیں گے ۔اب جاؤ اور اپنا کام

سنبھالو!"

اسلم حیران و پریشان ہوگیا...... ایک دم اتنا اضافہ؟ لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سچ ہے ...... دماغ پر اب بھی برطرفی کا لفظ ہتھوڑا بن کر لگ رہا تھا۔ سو اٹھ کر صاحب کی میز کے قریب آیا اور کہنے لگا "جناب! بات دراصل یہ ہے کہ......"

اب تو صاحب چڑ گئے اور تلخ لہجے میں بولے "ہاں ہاں یہ کہو کہ ہماری فرم کی ترقی دیکھ کر کسی اور فرم نے حسد کی وجہ سے زیادہ تنخواہ دینے کی آفر کی ہے۔ اور تم استعفیٰ دے کر ہی رہو گے لیکن میاں! ہم بھی کچی گولیاں نہیں کھیلتے۔ ہم ایک سو مزید کا اضافہ کر دیں گے لیکن استعفیٰ ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ تم بھی اضافے کو قبول کرلو اور ہماری قدر شناسی کو بھی...... بس اب آگے کچھ نہ کہنا "صاحب نے افسرانہ انداز میں ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا "اب تم اپنی سیٹ پر جا سکتے ہو۔ ترقی کے راستے تمہارے منتظر ہیں۔"

صاحب نے گویا اُسے جانے کا اشارہ کر دیا اور اسلم اپنے ذہن میں چاند سی منگیتر کا تصور لیے ترقی کو خواب نہیں بلکہ حقیقت سمجھ کر اُٹھا۔

وہ دل ہی دل میں چاند چہرے کو منحوس نہیں بلکہ اپنے من آنگن کا چاند سمجھتے ہوئے ہر طرف خوش قسمتی کی چاندنی کھلتے ہوئے دیکھنے لگا۔

(گ) 'لومبا کی شہادت'

ہفت روزہ 'انسان' حیدرآباد کا ایک اداریہ جو ڈیپلائی صاحب نے ۲۰ فروری ۱۹۶۱ء کو تحریر کیا

آج ساری آزاد دنیا سوگوار ہے۔ آج بھی آزادی پسند انسانوں کی آنکھیں اشکبار ہیں۔ آج چاروں طرف اُن کمینے آدمیوں پر پھٹکار برس رہی ہے جن کے ہاتھوں پر فقط آزاد کانگو بلکہ ساری دنیا کے باحیت انسانوں کے محبوب رہنما پیٹرک لومبا اور ان کے دو ساتھی بے دردی سے شہید ہو چکے ہیں۔

ان کا قصور...... ؟ کمینوں اور ظالموں کی نظر میں فقط یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ملک کو وحشی

بلجیموں کی غلامی سے نجات دلائی ۔اُن کمینوں کے کمینہ پن کی حد یہ تھی کہ ان کے زیرِ انتظام پورے کانگو میں صرف دس بارہ میٹرک پاس افراد تھے اور پھر مجاہدوں کی قربانیوں سے مجبور ہوکرآزادی دینے کے بعد بھی شاہِ بلجیم کانگو کے اعلیٰ سرپرست بنے رہے اوران کی شان میں یہ ترانہ سنا جاتا رہا کہ ''خداوندا! ہمارے شہنشاہ کو سلامت رکھ''۔وہ اب بھی کئی سال تک ملک کی دولت کولوٹنا چاہتے ہیں۔یہ ذلت قبول کرنے سے مجاہدین نے صاف انکار کردیا۔

مگرانسانیت کوذلیل کرنے والے''داگ ہیمر شوبد'(سیکریٹری جنرل اقوامِ متحدہ) کی سازش سے۔بلجیموں نے ایک طرف اپنے فوجی پٹھے،موبوتو،کواُبھارااوردوسری جانب ہیروں جواہروں کی کانوں والے حصے کٹنگا میں 'شومبے' کوکھڑا کیا پھران سب نے مل کر دھوکے بازی سے مجاہدوں کوگرفتار کرلیااور قصائیوں کے حوالے کردیا۔

آج کانگو ہی نہیں ساری آزاد دنیا کے اس چمکنے والے ہیرو نے جامِ شہادت پی لیا ہے۔آج اس کے بچوں میں سے ایک چاچا ناصر کی گود میں قاہرہ جاکر گریہ وزاری کررہا ہےاوردوسرے کانگو میں ماتم کناں ہوکراپنے باپ کی لاش طلب کررہے ہیں اوردنیا کے سب غیور اورحُریت پسند انسان وہاں کھڑے ہیں جو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک 'شومبے' کسابرو اور'موبُوتو'جیسے ذلیل انسانوں کے ناپاک وجود سےفرشِ زمیں بالکل پاک نہ ہوجائے،جب تک بلجیم کاایک ایک فردکانگو سے نہ نکل جائے اور جب تک ان کاپڑوسی سازشی،داگ ہیمر شوبد،اقوام متحدہ کےانسانیت سدھارادارے سے ذلت کےساتھ نہ نکالا جائے۔

شہیدلومبا!

تجھ پراور تیرے غیورساتھیوں پرسلام

تم پرجوظلم ہوئے انہوں نے سامراج کودنیاکے بازار میں ننگا کردیا ہے۔

تمہاری بے مثال قربانیوں پردنیا کے سبھی غیور اور باحمیت انسانوں کو ناز ہے۔آج تمہاری محبت نے نہ صرف کانگو کی غلامی کے بندھنوں کوٹکڑے ٹکڑے کردیا بلکہ پورے افریقہ میں ہی

کیا ساری دنیا میں شہنشاہیت کی جڑیں اکھاڑ دی ہیں۔

تمہارے پاک لہو نے تمام عالم میں آزادی کے پھول کھلا دیے ہیں اور وہ وقت قریب ہے جب کوئی بھی ملک کسی بھی شہنشاہ اور کسی بھی سامراجی لیڈر کی تشریف فرمائی پر سلامتی کا بینڈ نہیں بجائے گا۔

آج تمہاری شہادت نے جس طرح غریب ملکوں کے غیور انسانوں کو دُکھی کیا ہے اسی طرح سامراجیوں اور سرمایہ داروں کے اعلیٰ سے اعلیٰ پیشوا، جان کینیڈی کو بھی بہت دُہلا دیا ہے۔

آج خود وہ 'آئزن ہاور' بھی اپنی لگائی ہوئی دیا سلائی کے شعلے آسمان تک پہنچتے ہوئے دیکھ رہا ہے جس نے سمجھا تھا کہ اپنی از چنوں سے وہ زیادہ عرصے تک سامراجیت کو طول دے سکے گا۔

سامراجی بالا دستوں نے تمہارا سر نہیں کاٹا بلکہ سامراجیت ہی کو ریزہ ریزہ کیا ہے۔تم نے اپنا گلا کٹوا کر کروڑوں غلاموں کی گردنوں کو آزادی دلوائی ہے۔

''عالمے راز ندہ کردی آفریں بر مردنت''

(تم نے ایک عالم کو زندہ کر دیا،تمہاری مردانگی پر آفریں ہے)

تم نہیں مرے ہو بلکہ سامراجیت کو موت آئی ہے۔تم تو زندہ ہو اور ہمیشہ زندہ رہو گے۔دنیا کے حُریت پسند انسان تمہارا نام ہمیشہ سر بلند رکھیں گے۔

آج آزادی کے آسمان پر منڈلاتے کالے بادل سخت پریشان ہیں۔لومبا جیسے شخص کے شہید ہونے پر اُن پر 'رعد' کے چابک خوب برس رہے ہیں۔اُن شہیدوں کے خوں سے رنگے لال چابک کالے بادلوں پر ایسی زوردار ضربیں لگا رہے ہیں کہ ان سے چمک دمک اور چنگاریاں نکل کر ایک طرف تو ظلم کے ٹھکانوں کا قلع قمع کر رہی ہیں اور دوسری جانب پوری انسانیت پر آزادی کے زوردار چھینٹے برسا رہی ہیں۔

اس عبارت کے بعد شاہ جو رسالو کے سر سارنگ سے کچھ بیت بھی ڈیپلائی صاحب نے اظہار محبت و عقیدت کے طور پر پیش کیے ہیں۔

تحقیقی و تنقیدی مضامین کی جھلکیاں

ڈیپلائی صاحب ایک کثیرالجہاتی صاحب قلم تھے۔ ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی مطبوعہ صورتوں میں موجود ہیں ان میں سے چند مضامین کی جھلکیاں پیش کی جارہی ہیں تا کہ قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ افسانوی ادب سے قطع نظر تنقید و تحقیق کے شعبے میں بھی ان کے قلم نے قابل قدر تحریریں چھوڑی ہیں۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا مجموعہ جو شاہ جو رسالو کے نام سے موسوم ہے۔ جس کی گہری روحانی معنویت کو عام فہم بنانے کے لیے شرحیں لکھی گئیں تاہم ڈیپلائی صاحب کا موقف یہ تھا کہ:

'شاہ جو رسالو کی شرح تنہا صرف وہی لکھ سکتا ہے جو سندھ کے ہر علاقے کے دیہات میں کافی سال گزار چکا ہو اور عوام سے ملتا جلتا رہا ہو علاوہ ازیں مثنوی رومی، بھگت کبیر داس اور ایسے ہی اُن دیگر صوفی شاعروں کا بھی اچھی طرح مطالعہ کر چکا ہو جن سے شاہ صاحب کافی حد تک متاثر رہے تھے لیکن چونکہ ایسا شخص ملنا محال ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اوّل تو یہ بورڈ کا نیا مرتب کرایا گیا نسخہ بھی شاہ شناسوں کو دکھایا جائے کیونکہ ایسے سرکاری رسالے جو ایک مرتبہ غلط چھپے تو کم از کم سو برس ایسے ہی گزرتے رہے ہیں اور دوسری بات یہ کہ اپنے وقار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے مرتب کوئی بھی اصلاح کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ بورڈ کی یہ بہت بڑی غلطی ہوگی اگر یہ رسالہ ذی علم اصحاب کو دکھائے بغیر شائع کیا گیا۔''

ڈیپلائی صاحب کا ایک مضمون شاعر ہفت زباں حضرت سچل سرمست کے بارے میں ہے۔ کہا

جاتا ہے کہ سچل سائیں کے دادا میاں صاحبڈنہ شاہ لطیف کے ہمعصر اور اچھے دوست تھے۔ایک مرتبہ شاہ صاحب میاں صاحبڈنہ سے ملنے درازا شریف گئے تو میاں صاحبڈنہ کے پاس ایک نونہال کو دیکھا اور فرمایا: ''میں نے جو دیگ پکائی ہے اس کا ڈھکنا یہ نونہال اتارے گا''۔واقعی شاہ صاحب کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی کہ سچل سائیں اتنے توانا اور بے باک لہجے کے صوفی شاعر ہوئے کہ منصور ثانی کہلائے۔

ڈیپلائی کے مضمون کا عنوان اسی رعایت سے ہے یعنی

''لطیفی دیگ کا ڈھکن اتارنے والے حضرت سچل سرمست''

اپنے اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''سچل سائیں نہ صرف منصور کا مظہر تھے بلکہ صحیح معنوں میں انہوں نے اپنے جدِ امجد حضرت عمر فاروقؓ کی جرأت کا مظاہرہ کر کے دکھایا۔سندھ میں ان کے ہزاروں معتقد ہیں جن میں سبھی مذاہب کے افراد شامل ہیں کیونکہ وہ اس تحریک کے علمبردار تھے جس میں پوری انسانیت اور تمام کائنات اسی ایک ہستی کا مظہر سمجھی جاتی ہے جو اس کی خالق ہے۔''

ڈیپلائی صاحب کا ایک زوردار مضمون شیخ ایاز کی شاعری کے بارے میں ہے۔۱۹۶۴ء میں شیخ ایاز کی سندھی شاعری کا پہلا مجموعہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے مرکزی کتاب گھر کراچی سے شائع ہوا۔اس پر گلڈ ادبی انعام بھی دیا گیا لیکن ۱۹۶۵ء میں اسے بحق سرکار ضبط کرلیا گیا اور شیخ صاحب جیل کے حوالے کر دیے گئے، حالانکہ گلڈ کی مرکزی مجلس عاملہ کے رکن تھے اور گلڈ کو قدرت اللہ شہاب کے حوالے سے سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی۔سندھی اہلِ قلم نے مجموعے کی بندش اور شیخ ایاز کی گرفتاری پر سخت احتجاج کیا جس کا اظہار ڈیپلائی صاحب کے مضمون سے بھی ہوتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ان کے کلام میں حقیقی سوز ہے، دلی درد ہے، وہ نہ فقط اپنے وطنی عوام کی ذلت اور تذلیل پر تڑپتے ہیں بلکہ پوری انسان ذات کے لیے ان کا من بے چین ہے ساتھ ہی اپنے اور عالمِ انسانیت کے دکھ دور کرنے کا سبق اور صلاحیں بھی ہیں جن کے سبب ان کی شاعری نے سندھ میں

ہلچل پیدا کی ہے۔اُن کی آواز کی بازگشت پورے ملک میں گونجنے لگی اور ہر چھوٹا بڑا سندھ پہ اپنی جان وارنے کو تیار ہوگیا۔''

اب اس مضمون کا ایک اقتباس دیکھئے جو ڈیپلائی صاحب نے ''سندھی ادب میں طنز ومزاح'' کے موضوع پر تحریر کیا تھا۔

''زبانی طور تو چوپالوں ، دیہی علاقوں کی غیر رسمی محفلوں اور عموی قُرب کچہریوں میں سندھی کے مزاحیہ ادب کا سلسلہ رہا مگر تحریر میں 'شاہ جو رسالو' کو اولیت حاصل ہے کہ اس کے ایک سُر (باب) میں 'وگندہ' (ایک لا اُبالی فقیر کا کردار جو گندار ہنے والا اور چیونٹم کا ہے۔شاہ سائیں اس سے تفریح لیتے اور طنز و مزاح کے انداز میں چھیڑ چھاڑ فرماتے تھے) کا ذکر ہے ۔ کہاوتوں اور ضرب الامثال کی کتاب گل شکر، میں بھی مزاحیہ ادب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

میری نظر میں پہلا صحافتی مزاح شمس الدین بلبل مرحوم کے رسالہ 'معاون' میں دیکھنے کو ملتا ہے جس کی اشاعت سندھ مدرسہ کراچی سے ہوئی تھی ۔اس میں سے خاص مضمون یکجا کر کے بلبل نے درج ذیل کتابوں میں شائع کرائے۔چو ڈھن چمن-بلبگي کریما ۽ نيجري ما مقيمان

ڈیپلائی صاحب کے مضامین میں ایک مضمون 'شہید انسانیت ابراہیم لنکن کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں ہے ۔ مضمون کی ابتداء وہ خواجہ حافظ شیرازی کے ایک شعر سے فرماتے ہیں ۔

هرگز نه میرو آں که دلش زنده شد به عشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوامِ ما

اصل مضمون دس صفحات پر مشتمل ہے اور یقیناً بڑی اہمیت کا حامل ۔ یہاں اس مضمون کی تلخیص پیش کر رہا ہوں۔

'انسان ،انسان کا غلام ہے'۔

''بار بار اس کے دماغ میں یہ آواز گونج رہی تھی ۔ پھر یہی گونج ایک سوال بن گئی آخر کیوں؟...... کیوں ایک انسان دوسرے انسان کو غلام بناتا ہے؟ کیا یہی انسانیت ہے؟

طرح طرح کے سوال اس کے دماغ میں چکر کاٹ رہے تھے ۔اس کی آنکھوں کے سامنے قدآور وطاقتور حبشی جوان ۔زنجیروں میں جکڑے ہوئے، چابکوں اور ہنٹروں کے وار پہ وار سہتے ہوئے اپنے گورے آقاؤں کے لیے سامان ڈھور ہے تھے ۔

یہ غلام کون تھے؟ کہاں کے تھے؟ یہاں کیسے آئے تھے؟ ۔ یہ سوال اور یہ سوچ انسان کی درندگی کا ایک دردناک نظارہ دکھاتی تھی ۔''

اس عبارت کے بعد مضمون نگار نے دنیا کے جغرافیائی تناظر میں سات برِ اعظموں یعنی ہفت اقلیم کا ذکر کیا ہے پھر براعظم افریقہ کی پسماندگی اور جنوبی ایشیا کی درماندہ نسلوں کے حال زار کا تذکرہ اور افریقی باشندوں پر یورپ کی گوری نسلوں کے مظالم کی دردناک داستان اور اس حقیقت کا انکشاف کہ:

''انھوں نے سارے افریقہ پر قبضہ کرلیا اور غریب شیدیوں کو پکڑ پکڑ کر یورپ لے جا کر رکھا ۔پھر جب انگلینڈ وغیرہ کے گورے باشندے امریکہ میں آباد ہو گئے تو وہاں بھی حبشی غلام ان کی خدمت میں موجود رہے ۔''

ڈ-یلائی صاحب نے گوری اور کالی نسلوں کے فرق وامتیاز کو واضح کرتے ہوئے اپنے موضوع کی مناسبت سے آگے چل کر تحریر کیا ہے کہ:

''غلاموں کی جس دردناک حالت کا ذکر کیا گیا وہ امریکہ کے بندر نیو آرلینس سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ حالت وہاں ایک انیس سالہ نوجوان ابراہیم لنکن نے دیکھی تھی جو ۱۸۲۰ء میں ایک بیوپاری کے گماشتے کی حیثیت میں وہاں آیا۔

نوجوان ابراہیم لنکن کو زندگی سے پیار تھا ۔ وہ ۱۲ فروری ۱۸۰۹ء کو ایک غریب کسان کے گھر میں پیدا ہوا ۔ والدین کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے جو بیٹے کی معقول تعلیم پر خرچ کیے جا سکیں ۔شفیق ماں

غریبی کے دکھ سہتے سہتے اس وقت دنیا چھوڑ گئی جب بیچارہ ابراہیم ۹ برس کا تھا۔ وہ اپنے غریب باپ کے ساتھ محنت مزدوری کے کام کرتا مگر اسے تعلیم حاصل کرنے کا شوق بھی بہت تھا اس لیے تمام تر جفاکشی کے باوجود کچھ نہ کچھ وقت مل جاتا جو حصول تعلیم کے کام آتا۔ کوئی بھی تعلیم یافتہ مسافر یا کوئی پادری اس کے گاؤں میں آتا تو وہ اس سے تھوڑا بہت سبق لیتا رہتا۔ بیچارے کے پاس کتابیں خریدنے کو بھی پیسے نہ تھے اس لیے وہ اکثر بغیر کتاب کے کچھ اوراق سے ہی کام چلاتا۔ یوں بھی ہوتا بعض اوقات دور دراز مقامات تک پیدل چل کر کوئی کتاب حاصل کرتا۔

وہ بچپن ہی سے نہایت ایماندار اور محنتی تھا۔ اس نے جن بیوپاریوں کی بھی ملازمت اختیار کی وہ اس کی ایمانداری اور محنت کی مثال دیتے تھے۔

آج بھی اس کی زندگی کے حالات غریب بچوں کے سچے رہبر ہیں جو اپنے سینوں میں بڑے عزائم رکھتے ہیں۔

ابراہیم لنکن نے غلام حبشی کسانوں کو کام کرتے دیکھا تھا ان کے لیے بھی ہر وقت اس کے دل میں دردمندی کا احساس جاگتا تھا۔ ان شیدیوں کی بری حالت نے اسے جوش دلایا اور اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ الینوائے اسٹیٹ کی اسمبلی کا رکن بن کر رہے گا۔ تب اس نے قریب قریب دو سال ویرانوں اور بیابانوں میں جا کر تقریر کرنے کے فن کی متواتر مشق کی جہاں داد دینے اور تالیاں بجانے کو درختوں کے سوا کوئی نہ ہوتا۔

جب انتخابات کا مرحلہ آیا تو ایسا ہی ہوا جیسا ہمارے ملک میں غریب اور انسانیت کا درد رکھنے والے امیدواروں کے ساتھ ہوتا ہے کہ امیر امیدواران ان کو ہر طرح دبانے اور تکلیفیں دینے میں پیش پیش رہتے ہیں۔

اسے بھی طرح طرح ستایا گیا مگر وہ ہمت نہ ہارا اور عوام تک رسائی حاصل کرنے سے منہ نہ موڑا۔ جنہوں نے اسے ووٹ نہ دیا ان سے بھی وہ برابر رابطہ کرتا رہا اور ان کی بھلائی کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور آخر کار وہ اسمبلی کا ممبر بن گیا۔

اسمبلی کی رکنیت کے تین سال کے دوران اس نے بڑی دیانت داری اور خلوص سے عوام کی نمائندگی کا حق ادا کیا کہ آگے چل کر وہ مرکزی پارلیمنٹ کا رکن بھی منتخب ہوا اور اس نے غلامی کے خاتمے کی بھرپور مہم چلائی مگر مخالفوں کا اتنا زور تھا کہ اسے غلاموں کی حمایت کرنے کے نتیجے میں انتخاب ہونے پر بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

ناکامی سے وہ مایوس نہ ہوا بلکہ اس کی کوششوں سے ریپبلکن پارٹی قائم ہوئی وہ شخص جو مرکزی رکنیت میں ناکام رہا تھا وہ پورے ملک کی صدارت کے لیے امیدوار بنا، اسے یقین تھا کہ عوام اسے منتخب کریں گے۔''

اس عبارت کے بعد ڈیپلائی صاحب نے خاصی تفصیل سے ابراہیم لنکن کی عوامی مقبولیت پر روشنی ڈالی ہے اور ایک نوجوان دوشیزہ کا خط بھی پیش کیا ہے جس نے اسے داڑھی بڑھانے کا مشورہ دیا تھا تا کہ دبلا پتلا چہرہ کچھ رعب دار ہو جائے۔

خط کے جواب میں اس نے لکھا تھا:

''یہ تم نے کیا لکھ دیا کہ داڑھی اور بڑھالوں بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ لوگ ان چیزوں کے سبب آدمیوں کو اچھا سمجھیں۔''

جب ابراہیم لنکن امریکہ کا صدر منتخب ہو گیا تو بذات خود جا کر اس بچی سے ملا اور اسے گلے لگایا۔ وہ انسان ذات سے سچی محبت کرنے والا انسان تھا۔ یکم جنوری ۱۸۶۳ء کو صدر کی حیثیت سے اس نے غلامی کے خاتمے کا اعلان کیا جس سے وہاں کے وڈیرے اور سرمایہ دار لنکن کے دشمن ہو گئے اور ۱۴راپریل ۱۸۶۵ء کو انسانیت کے سچے محسن کی انسان دوستی گولی کا نشانہ بنی۔''

تصانیف کے حوالے سے
تبصرے اور تنقیدی جائزے

ڈیپلائی صاحب کی تصانیف پر مجموعی لحاظ سے ممتاز اہل قلم نے جو تبصرے اور تجزیے سپرد قلم کئے ان کی جھلکیاں تو اگلے باب میں 'ناقدین کی آراء' کے زیرِ عنوان یکجا کی گئی ہیں تاہم چند ایسی شاہکار تصانیف بھی ہیں جن کے تراجم دوسری زبانوں اور خصوصاً اردو میں ہوئے ہیں۔ ان کا تحریر کردہ مشہور ناول 'سانگھڑ' اتنا مقبول ہوا کہ اب تک اس کی مسلسل اشاعتوں کا سلسلہ جاری ہے۔

اس ناول کا موضوع وہ تاریخی جنگ ہے جو برطانوی اقتدار کے خلاف سندھ کی آزادی کے لیے حُروں کے پیر و مرشد پیر پاگارا شہید کی قیادت میں لڑی گئی۔

ممتاز افسانہ نگار، دانشور اور ماہرِ تعلیم جناب حمید سندھی نے اس عہد آفریں مزاحمتی ناول پر بھرپور تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سانگھڑ ناول کے ذریعے ڈیپلائی صاحب نے سندھ کے ایک عظیم سپوت اور مجاہد پیر صبغت اللہ شاہ راشدی پاگارہ کے کردار کو نہ صرف اُبھارا ہے بلکہ حُر تحریک، کے ہر مجاہد کو الگ الگ زاویوں سے اس داستان کا ہیرو بنایا ہے۔ یہ ناول دراصل ایک داستان کے اندر کئی داستانوں کا مجموعہ ہے جس میں اس دور کو بیان کیا گیا ہے جب سندھ غلامی کے ایک نئے دور سے گزر رہا تھا۔ حُر تحریک' سندھ والوں کے لیے ایک نیا پیغامِ حُریت لائی تھی۔ ڈیپلائی صاحب نے اس ناول کا خاکہ اور کرداروں کا منصوبہ قید و بند کے زمانے میں سوچا۔ ان کا یہ خیال کہ 'انسان آزاد پیدا ہوا ہے' اس پورے ناول کا بنیادی محرک ہے۔ اس ناول کے کردار ہمارے دیکھے بھالے ہیں مثلاً

سیٹھ، خان صاحب، وڈیرا، افسر، کمشنر، پولیس والے نیز وہ مظلوم کسان مزدور اوران کے اہل خانہ ہیں جو 'حُر تحریک' یا 'بنیادی حقوق انسانی' کی تحریک چلاتے ہیں۔"

حمید سندھی صاحب نے غریب سندھی خواتین کی بہادری، ثابت قدمی اور پروانہ وار اپنے شوہروں پر قربان ہونے کے جذبے کو بڑی اہمیت دی ہے۔

تبصرے میں حمید سندھی نے کچھ مثالیں بھی ناول کے متن سے اخذ کرتے ہوئے تنقیدی بصیرت کے ساتھ پیش کی ہیں مثلاً بقول ان کے:

"سماجی اور اقتصادی حالتوں کو بیان کرنے کے لیے ڈیپلائی صاحب نے ایک ہاری 'گاموں' اور اس کی گھروالی کی دردناک داستان بیان کی ہے۔ ان کی داستان کوئی عجیب ہے کہ قاری اس ناول کو پڑھنا شروع کرے تو جب تک ختم نہ کرلے اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ ان کے جذبات کی روانی قاری کے جذبات کی روانی بن جاتی ہے۔"

ایک اور خیال افروز تبصرہ ممتاز ادیب و شاعر قمر شہباز کا میرے سامنے ہے جس میں تبصرہ نگار نے سانگھڑ ناول کو ڈیپلائی صاحب کا کارنامہ قرار دیتے ہوئے جدید سندھی نثری تصانیف میں مزاحمتی ادب کی بنیاد رکھنے والا بتایا ہے۔ ان کے تبصرے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"سانگھڑ ناول ڈیپلائی صاحب کے اخلاص اور بے باکی کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس کی اہمیت جتنی کل تھی آج شاید اس سے زیادہ ہے۔ سندھی قوم کو مجموعی طور پر بزدل اور سست ثابت کرنے والوں کے لیے یہ ناول ایک دستاویزی انکاری ثبوت ہے جس میں سندھیوں کی مزاحمتی صلاحیتیں، بہادری اور تنظیمی قابلیتوں کے ایسے پکے اور سچے واقعات بیان کئے گئے ہیں جن کو رد کرنا مورخوں کے بس کی بات نہیں۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی جنگ آزمائی، محبت سے اپنے فرض کو بالاتر رکھنے کا عزم اور ملک و قوم پر جان نچھاور کرنے کے یادگار واقعات کو ڈیپلائی نے بڑی چھان بین سے یکجا کیا ہے اور کمالِ مہارت سے ناول کے روپ، سروپ میں جذب کئے ہیں۔ 'حُر تحریک' جسے انگریزوں نے بغاوت کا نام دیا، کتنے ہی مجاہدوں اور وطن دوستوں کو

سولی کا سزاوار ٹھہرایا۔ اس تحریک کی حقیقت سے واقف ہونا ہر سندھی وطن دوست کا فرض ہے۔ پروانوں کی طرح اپنے سروں کو قربان کر دینا سچائی کے لیے جان فدا کرنے کا سبق ہے جو پیر کے فقیر دے گئے، ان کی روشنی میں سندھ کی موجودہ محرومیوں کا علاج تلاش کرنا آج کے نوجوانوں پر واجب ہی نہیں فرض ہے۔''

اب اس تبصرے کی جھلک بھی دکھاتا چلوں جو کسی پاکستانی اور کسی ایسے صاحب قلم کا نہیں جو فی الوقت سندھ کے کسی شہر کا باسی ہو بلکہ ہمسایہ ملک بھارت میں سندھی زبان اور سندھی ادب کے جو شیدائی ہیں انہیں میں ایک نام محترمہ کلا پرکاش کا ہے۔ موصوفہ نے 'ساگھڑ' کو ایک لافانی تخلیق کا درجہ دیتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے کہ:

''اس ناول کا موضوع وہ تاریخی جنگ ہے جو سندھ دھرتی کی آزادی اور حق و انصاف کے لیے لڑی گئی۔ یہ کوئی تصوراتی تخلیق نہیں بلکہ اس کے حقیقی تاریخی کردار ہیں۔ پیر صاحب پاگارہ اور ان کے مرید غازی، جن کو حروں کا نام دے کر آزار دیے گئے، پھانسی پر لٹکایا گیا پھر بھی باقیماندہ مردوں، عورتوں اور غریب غازیوں نے تحریک کو جاری رکھا۔

پیر صاحب پاگارہ اور حروں کو سندھ کی تاریخ میں جائز مقام حاصل ہو اس مقصد کے لیے ڈیپلائی صاحب نے بڑی جانفشانی سے اصل حقائق کو ناول کے روپ میں پیش کیا ہے کچھ اس طرح کہ جیسے صاحب قلم بذات خود بھی 'غازی تحریک' کا حصہ بن گیا ہو۔''

حال ہی میں بازا ایجوکیشن کمیشن اسلام آباد کے زیر اہتمام ایک قابل قدر تحقیقی کتاب سندھی نثر کی اصناف پر محترمہ پروین موسیٰ میمن کی تصنیف کے طور پر شائع ہوئی ہے۔ موصوفہ ایم۔ بی اینڈ جی۔ ایف گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج حیدرآباد میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں، سندھی زبان و ادب کا مطالعہ اور تحقیقی مضامین لکھنا خصوصی مشغلہ رہا ہے۔ کتاب کا نام ہے '' سنڌي نثر جي ڪن صنفن جو اڀياس 'یعنی سندھی نثر کی کچھ اصناف کا جائزہ''۔

اس تحقیقی کتاب کی اہمیت و افادیت کا اعتراف ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور ڈاکٹر غلام علی الانہ جیسی

ممتاز شخصیات نے بھی کیا ہے۔

کتاب میں دیگر اصنافِ ادب سے قطع نظر ایک تفصیلی جائزہ سندھی ناول نگاری سے عبارت ہے جس میں ڈیپلائی صاحب کے شاہکار ناول 'سانگھڑ' کا تجزیہ بھی شامل اشاعت ہے۔

یہ تجزیہ بڑے سلیقے سے رقم کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اس کا تعارف ہے پھر ذیلی عنوانات کے تحت ناول کے تمام پہلو زیرِ تبصرہ آئے ہیں جو تحقیقی معلومات پر مبنی ہیں مثلاً 'سانگھڑ' کی اختصاری صورت، سانگھڑ کا ٹائیٹل کور، سانگھڑ کا اُردو ترجمہ، پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے ۱۹۶۳ء میں بہترین سندھی ناول کا انعام پانا، اس کے لکھنے کا سبب سنٹرل جیل حیدرآباد میں سی کلاس کے قیدی کی حیثیت میں چالیس دن گزارنا، حُر تحریک کا تعارف، حُر رہنماؤں کا تعارف اس کے بعد ناول کا مجموعی جائزہ، متعلقہ کہانی، ناول کی علمی و ادبی حیثیت، زبان و بیان، سندھی ادب کی ناول نویسی میں سانگھڑ کا مقام اور مختلف اہلِ تحقیق، عالموں اور ادیبوں کی آراء۔

تجزیہ نگار نے اس ناول کو ضخیم ترین ناول کا درجہ دیتے ہوئے کلاسیکی حیثیت دی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق یہ ۱۹۶۳ء میں لکھا گیا۔ چھ سو صفحات پر مشتمل تھا، تیسری اشاعت کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ ناول کی ضخامت کو کم کیا جائے۔ چنانچہ عثمان ڈیپلائی صاحب کے فرزند محمد علی ڈیپلائی نے جو بذاتِ خود بھی ادیب و دانشور ہیں ناول کی اصل روح کو برقرار رکھتے ہوئے طویل حصوں کو الگ کر کے مختصر کیا۔ اس طرح چوتھی اشاعت کے لیے مجموعی ضخامت ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہو گئی جو ۱۹۹۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔

پروین موسیٰ نے سندھی ادب میں اس ناول کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنے کے سلسلے میں مربوط دلائل سے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ سندھی ادب کی ناول نویسی میں اسے ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے جو قائم رہے گا۔ ان کے خیال میں:

''سندھی علم و ادب کے لیے ہندو سندھ میں یوں تو کتنے ہی ناول لکھے گئے ہیں جو مختلف موضوعات پر ہیں۔ تاریخی اور قومی موضوع پر لکھے گئے ناولوں میں نور جہاں، سُندری، ہمہ اوست

، موہن جوڈرو اور کئی دوسرے ناولوں کے نام آتے ہیں لیکن ساگھڑ کا ایک منفرد مقام ہے۔ یہ برصغیر کی سیاسی تاریخ اور بیسویں صدی کی سیاسی حالتوں کا عکس ہے۔ بیک وقت یہ ناول کرداری، سماجی، سیاسی اور قومی ہونے کی خصوصیات اپنے آپ میں سموئے ہوئے ہے۔

ڈیپلائی صاحب نے حُریت اور آزادی کے موضوع کو اپنی نگارشات میں ہمیشہ اولیت دی ہے ۔ان کے تحریر کردہ قومی و تاریخی ناولوں میں انسانی آزادی کی امنگ کے اس فطری جذبے اور قومی ناموس کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، غازی مصطفیٰ کمال، شیرِ ایران، مجاہدِ کشمیر اور 'انقلاب ایران' جیسے کئی ناولوں میں انہوں نے نمایاں کیا۔

'ساگھڑ' ناول خود مصنف کے بقول حُرتحریک کے مثبت رُخ کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ 'ون یونٹ' توڑو تحریک کی تائید میں تھا کیونکہ ایک باشعور بیدار مغز صاحب قلم عصری تقاضوں کے ساتھ چلنے والا ہوتا ہے۔

یہ ضروری ہے کہ بہت ہی اختصار سے حوالہ جاتی طور پر متعلقہ آراء اور صاحبانِ قلم کے اسمائے گرامی لکھ دیے جائیں۔ مثلاً ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی کی تحقیقی کتابوں یعنی ''سندھی ادب کی مختصر تاریخ'' اور 'سندھی ادب کا تاریخی جائزہ' میں ناول نویسی کے سلسلے کا جو مواد ہے اس میں 'ساگھڑ' کی مقبولیت اور تاریخی اہمیت وافادیت کا ذکر بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''محمد عثمان ڈیپلائی کے ناول 'ساگھڑ' نے بڑی شہرت پائی ۔ اس ناول میں انگریزوں کے خلاف حُرمجاہدین کی شجاعت اور بہادری کی داستان رقم کی گئی ہے۔''

امر جلیل کا نام سندھی ادب کی تاریخ کا ایک نمایاں نام ہے۔ وہ ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ اُردو، سندھی اور انگریزی میں افسانوں کے علاوہ تنقیدی مضامین اور کالم بھی لکھتے ہیں۔ زیرِ تذکرہ ناول کے بارے میں ان کی انگریزی تحریر کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"It is a big novel, in content, as well as in value Its canvas is vast. it depicts the corruption of the bureaucracy. Blended with delicate human emotions, love and hate, betrayal and patriotism, crime and

punishment, hope and disillusion, the novel brings to the forethe famous Hur movement against the British in Sndh".

ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو 'سندھی ادب کی مختصر تاریخ'' میں لکھتے ہیں:

'' محمد عثمان ڈیپلائی ایک ایسے ادیب ہیں جنھوں نے کچھ ہنگامی مسائل، سماجی برائیوں اور انقلابی موضوعات پر ناول لکھے۔ ان کے بہت سے ناول موضوع کے لحاظ سے بروقت ہیں جس کی ایک مثال 'سانگھڑ' ہے۔

سندھیوں کے مسائل پر لکھنے کے سبب ان بزرگ کو جیل میں ڈالا گیا جہاں 'حُر تحریک' پر 'سانگھڑ' کے زیرِ عنوان بڑا ضخیم ناول تحریر کیا۔ اس ناول میں مرد تو مرد عورتوں کی ہمت و جرأت جیسی مثال کہاں ملے گی۔''

ڈاکٹر نور افروز خواجہ، چیئرمین شعبہ سندھی، جامعہ سندھ تقسیم ملک کے بعد لکھے جانے والے ناولوں کا تجزیہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

'' اس ناول (سانگھڑ) میں نہایت ہی رنگین و دلکش انداز سے تہلکہ مچا دینے والے واقعات ہیں۔ عبرت انگیز فضا اور جنگ و جدل سے بھرپور مناظر ہیں جن میں زبان و بیاں اور مکالموں کی دلچسپ کیفیات بڑی عمدگی سے اجاگر ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر قاضی خادم سندھی کے صاحب تصنیف افسانہ نگار بھی ہیں اور محقق اور نقاد بھی۔ ان کا ایک تنقیدی مضمون بعنوان '' محمد عثمان ڈیپلائی ۔ جدید مزاحمتی ادب کا بانی'' ۷رفروری ۲۰۰۵ء کو روز نامہ'' عبرت'' میں شائع ہوا۔ 'سانگھڑ' پر موصوف نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ:

'' اس ناول کے موضوع و مواد کی فراہمی اور عدالت میں چلنے والی بحث سے قطع نظر، اس کا پیغام دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سندھی قوم مرد، عورت اور بچوں سمیت ایک غیرت مند قوم ہے، بہادر اور وطن سے پیار کرنے والی قوم، جو جان و مال کی پرواہ نہیں کرتی ۔ سانگھڑ کا ہر کردار اپنی جگہ پر بہادری اور پیار کا مجسمہ ہے ۔ یہ ناول بہر طور ایک مکمل ناول ہے جس میں نہ صرف وہ کچھ دکھایا گیا ہے جو حقیقت میں پیش آیا بلکہ وہ بھی سامنے لایا گیا ہے جو لکھنے والے کی سوچ کے مطابق تھا۔''

(الف) ناول 'سانگھڑ' کا اُردو ترجمہ

سندھی ناول نگاری کی تاریخ میں تو یقیناً اس ناول کو منفرد اور لافانی حیثیت حاصل ہے جس کا احساس و ادراک ان قارئین کو بھی ہو گیا ہوگا جو ڈیپلائی صاحب کی شخصیت اور کارناموں پر یہ کتاب پڑھ رہے ہیں۔

راقم الحروف نے جب اس عظیم ناول کا مطالعہ کیا تو بار بار یہ خیال آیا کہ کاش اسے ترجمے کی صورت دے کر اردو میں بھی پیش کیا جا سکے۔ یہ قریب قریب ۴۵ برس پہلے کا ذکر ہے۔ ان دنوں پاکستان رائٹرز گلڈ پورے پاکستان (مغربی اور مشرقی) میں بڑی فعال اور منظم تنظیم تھی۔ میں شمالی سندھ کے لیے سکھر سب ریجن کا اعزازی معتمد تھا اور شیخ ایاز مرکزی مجلس عاملہ کے رکن۔ انہوں نے ہی مجھے سندھی زبان کا یہ شاہکار ناول دیتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ اسے بہترین سندھی ناول ہونے پر گلڈ ادبی انعام کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔

موجودہ صدی کے آغاز میں ڈیپلائی صاحب کے صاحب قلم فرزند محمد علی ڈیپلائی نے یہ خوشخبری دی کہ بہن ڈاکٹر ثریا سوز ڈیپلائی نے "سانگھڑ" کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ بے انتہا خوشی ہوئی۔ خیر سے مسودے پر ایک نظر ڈالنے کی سعادت بھی میرے حصے میں آئی۔ برادرم محمد علی ڈیپلائی نے نظر ثانی کا حق ادا کیا اور فکشن ہاؤس لاہور سے ۲۰۰۲ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔

فکر انگیز دیباچہ ممتاز دانشور اور صاحب بصیرت تاریخ داں و تاریخ نویس ڈاکٹر مبارک علی نے تحریر کیا۔ فرماتے ہیں:

"تاریخ نویسی اور تاریخی ناول نگاری میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مؤرخ تاریخ لکھتے وقت واقعات اور ان کی شہادت کو ذہن میں رکھتا ہے اور جو بھی واقعہ بیان کرتا ہے اس کا ثبوت لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا مؤرخ ایک طرح سے پابندیوں کا شکار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ناول نگار جب تاریخی ماحول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تاریخی واقعات کی بنیاد پر لکھتا ہے تو وہ ان پابندیوں سے آزاد

ہوتا ہے۔ وہ آزاد ہوتا ہے کہ اپنے کردار خود تشکیل کرے، وہ آزاد ہوتا ہے کہ ان کرداروں کے ذریعے اس وقت کے ماحول، لوگوں کے جذبات واحساسات اور ان کے رویوں کو ظاہر کرے۔

ناول نگار اپنے تخیل کی بنیاد پر ماضی کو زندہ کردیتا ہے ایک ایسا ماضی کہ جو جاندار اور متحرک ہو جاتا ہے۔ اب یہ ناول نگار پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اپنے زور قلم سے کس حد تک تاریخ سے زندگی کو واپس لا کر اس میں جان ڈال دیتا ہے۔

ڈیپلائی صاحب نے جب 'سانگھڑ' ناول لکھا تو ان کے ذہن میں تاریخ کے اس پہلو کو سامنے لانا تھا کہ جو اب تک مؤرخوں کی نگاہوں سے دور تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ حُروں کی بغاوت انگریزوں کے خلاف تھی اس لیے بغاوت کے بارے میں جو بھی مواد تھا وہ مؤرخوں کی پہنچ سے دور رہا۔

انگریزی دور حکومت میں اس کو 'بغاوت'، سرکشی اور میونٹی سمجھا گیا اور اس نقطۂ نظر سے سرکاری دستاویز کی مدد سے اس پر تھوڑا بہت لکھا گیا۔

تاریخ کی یہ بدقسمتی ہے کہ یہ اُن لوگوں کی حمایت میں کام آتی ہے جو فتح یاب اور کامران ہوتے ہیں اور انہیں نظرانداز کر دیتی ہے جو شکست کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا جب مؤرخ کو مواد نہ مل سکے اور تاریخ کی تشکیل واقعات اور شہادتوں کی بنیاد پر نہ ہو سکے تو ایسے ماحول میں ناول نگاری سے کام لیا جا سکتا ہے۔

ڈیپلائی صاحب نے یہ ناول لکھ کر اس کمی کو پورا کیا جو تاریخ نویسی بھی تھی اور سندھ کے اس ماضی کی تشکیل کی جو سرکاری نقطۂ نظر سے مسخ ہو رہی تھی۔ اس ناول کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ 'ون یونٹ' کی تشکیل کے بعد لکھا گیا۔ 'ون یونٹ' نے ایک لحاظ سے سندھی نیشنل ازم کو پیدا کیا۔

نیشنل ازم کو ہمیشہ تاریخ کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کو ٹھوس بنیادیں فراہم کرے، 'سانگھڑ' ناول نے یہ کام کیا۔ اس میں امپیریل ازم اور انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی داستان ہے جو سندھ کے لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ حقوق کے لیے جدوجہد اور مزاحمت ضروری ہے اس کے بغیر حقوق حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔

اُردو زبان میں اس ناول کا ترجمہ اس لیے ایک اہم قدم ہے کہ سندھ میں رہنے والے اُردو
دان طبقے کو اس تحریک سے روشناس کرائے گا جو حُروں نے انگریزوں کے خلاف چلائی تھی
۔مزاحمت کا یہ سبق سندھی اور اُردو بولنے والے دونوں طبقوں کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ انہیں
اپنے حقوق کی جدوجہد مل کر کرنی چاہیے اور ساتھ ہی یہ سبق بھی سیکھنا چاہیے کہ بالادست حکمرانوں
کی گرفت سے کیوں کر آزاد ہوا جائے۔
حُروں کی شکست اور حکومت کی کامیابی سے بھی سبق سیکھا جائے کہ حقوق کی جنگ کن
ہتھیاروں سے لڑنی چاہیے۔ خاص طور سے کیا دہشت گردی اور تشدد کے ذریعے کامیابی حاصل
کی جاسکتی ہے؟ یا اس کے لیے دوسرا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔
یہ راستہ جمہوری راستہ ہے جس میں علم کا حصول اور ذہن کی پختگی ضروری ہوتی ہے۔ یہ وہ راستہ
ہے کہ جو لوگوں کو توانائی بھی دیتا ہے اور اقلیتوں کو اکثریت پر فوقیت بھی۔''
ڈاکٹر مبارک علی کے ارشادات قابل قدر ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محترمہ ڈاکٹر ثریا سوز
ڈیپلائی نے اپنے والد محترم کے تاریخ ساز کارنامے کو اردو زبان میں منتقل کر کے زندہ رہنے
والے ادب کی لائق تحسین خدمت انجام دی ہے جو مرحومہ کے نام اور کام کو ڈیپلائی صاحب کے
نام اور کام کی طرح زندہ رکھے گی۔
'سانگھڑ' کا انتساب بھی ڈیپلائی صاحب نے بڑے اچھوتے انداز میں ناول کے ایک اہم
کردار ''من میر بحر کے نام'' کیا ہے۔ کتنے اثر آفریں الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:
''جیسے ہی ہماری بس سندھڑی نہر کے موڑ تک پہنچی تو دور سے راستہ دریا کی لہریں بناتا دکھائی
دیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ چھوٹے افسروں نے خود ہی سڑک پر پانی چھوڑ دیا ہے تاکہ بڑا
صاحب سرزمیں کا معائنہ نہ کر سکے۔
ڈرائیور نے ایک زبردست گالی دے کر لاری کو ٹنڈو مٹھا خان کی طرف موڑ دیا کیونکہ 'کھپرو'
پہنچنے کے لیے اب بڑا چکر لگانا تھا۔

بس جب دستور کے خلاف ٹنڈو مٹھا خان میں رُکی تو تماش بین جمع ہو گئے۔ مسافر نیچے اُتر کر ہوا کھانے لگے، میں بھی ان کے ساتھ اُتر گیا کہ اچانک کسی نے چلاّ کر کہا:

''قاضی تم یہاں کیسے؟''

میں نے چلاّنے والے کی طرف دیکھ کر کہا 'ڈنو تم؟'

دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے اور خیر و عافیت پوچھنے لگے۔ 'ڈنو میر بحر' سے میری دوستی مرحوم عبداللہ پلیشی والے کے پاس نوکری کرنے کے دوران ہوئی اور آج ہماری ملاقات بیس سال بعد ہو رہی تھی۔ عام طور پر زمینداروں کے منشی کو قاضی کہہ کر بلایا جاتا ہے، اسی لیے ڈنو نے مجھے قاضی کہہ کر مخاطب کیا۔

حال احوال لینے کے دوران میں نے اس سے اپنے دوست 'مَن' کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے دھیمی آواز سے کہا:

'قاضی! 'مَن' بیچارے کو تو انگریز نے پھانسی دے دی۔'

'اف!' بے اختیار چلاّ کر میں نے کہا اور میری آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ ایک سیدھا سادا، شائستہ، قد آور نوجوان تھا، مجلس کا مور، مل بیٹھنے کا شوقین اور وقت پڑنے پر جان فدا کر دینے والا دوست تھا۔

''لیکن آخر کیوں؟'' میں نے ڈنو سے سوال کیا۔ 'مَن' تو پیر صاحب پگارہ کا مرید بھی نہ تھا، پھر اسے پھانسی کیوں دی گئی؟''

''ہزاروں کو شہید کیا گیا ہے، وہ سب پیر صاحب کے مرید تھے کیا؟'' ڈنو نے جواباً کہا۔ 'مَن' تو، خیر انگریزی قانون کے مطابق مجرم بھی تھا لیکن یہاں تو سینکڑوں بے گناہوں کو بھی سولی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ نہ داد نہ فریاد، کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ سینٹرل جیل میں مشہور برقعہ پوش چغلی خور نے ایک ایسے قیدی پر بھی ہاتھ رکھ دیا جو دوسری حُر ہلچل سے بھی پہلے کا قیدی تھا۔''

''ہاں یہ بات تو عالم آشکار ہے'' پھر میں نے سوال کیا ''لیکن 'مَن' کیسے مجرم بن گیا؟ وہ

پہلوان تو تھا لیکن اس نے اپنی جانبازی کبھی رہزنی میں نہ دکھائی۔ ایسا کوئی گمان ہمیں تو اس میں نظر نہ آتا تھا۔"

"رہزنی تو اس نے کی بھی نہیں تھی"۔ ڈنو نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا "اس کی من بھائی (محبوبہ) کو سیٹھ ...... نے دولت کے زور پر زبردستی لیجا کر داشتہ بنا لیا تھا وہ اتنے بڑے سیٹھ سے مقابلہ تو کر نہیں سکتا تھا لیکن اس کے دل میں انتقام کا جذبہ جوش مار رہا تھا۔ اتفاقاً سیٹھ جو اس وقت ظاہری طور پر حُروں کا حمایتی تھا لیکن سرکار کے پاس سخت مخالفت کرتا تھا اس نے مشورے دیئے کہ حُر جماعت کو نیست و نابود کیا جائے۔ سرکار کے آدمیوں میں بھی حُروں کے کئی ممبر ہیں۔ انہوں نے اس تازہ کارنامے کی خبر حُروں تک پہنچائی تو حُروں نے بھی اس کے سر کے وارنٹ جاری کر دیے۔ 'من' کو بھی دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔ مردود کو مارنے میں اور بھی کئی تھے لیکن پہلا وار 'من' ہی نے کیا تھا۔"

ایسے ہزاروں شہیدوں کی طرح 'غیرت مند من' کی قبر کا اتہ پتہ نہیں تھا لیکن سینٹرل جیل کے پہلے سفر کے دوران اس نے اس پھانسی گھاٹ کو تو ضرور سلام کیا تھا جہاں ایسے دیوانوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔

سندھ کے مجاہدوں کے تذکرے کا یہ ناول کسی بڑے آدمی کے نام کرنے کی بجائے 'من' جیسے غریب غیرت مندوں کے نام معنون کر رہا ہوں جو شیر کی ایک دن کی زندگی کو گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے ہزار گنا بہتر سمجھتے ہیں۔

"ڈیپلائی"

اس یادگار انتساب کے بعد محمد علی ڈیپلائی نے "گزارش" کے زیرِ عنوان جو عبارت رقم کی ہے اس سے اقتباسات پیش کرنا بھی اس لیے ضروری ہیں کہ ان سے وہ محرکات اجاگر ہوتے ہیں جو ناول کی تخلیق کا ذریعہ بنے مثلاً یہ انکشاف کہ:

"اپنی زندگی کے آخری ایام میں ڈیپلائی صاحب علامہ اقبال کا یہ شعر اکثر گنگناتے تھے۔

لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت

ہوں گی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

ان کی کتاب دل میں کیا رقم تھا اور خواب جوانی کیا تھا کوئی نہیں جانتا البتہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۸۰ء تک ان کی تقریباً ۱۵۰ کتابوں، بے شمار اداریوں اور انگنت کالموں میں ایک بات مسلسل اور واضح ہے اور وہ ہے رنگ، ذات، مذہب، نسل اور قومیت سے ماورا ظالموں اور استحصالیوں کی نشاندہی اور ان کی تجزیہ پور مزاحمت۔ اسی بنا پر انہیں سندھی صحافت اور ادب میں مزاحمت کا بانی اور قائد کہا جاتا ہے۔ اپنے اوائلی ناولوں کی ابتدا، وہ اس دعا سے کرتے تھے۔

یا رب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے

وہ بات دے قلم کو جو دل پر اثر کرے

آگے چل کر ان کے ناولوں کی ابتداء اس سندھی دعا سے ہونے لگی۔

یا الٰہی کر عطا میرے قلم کو وہ کمال

وہ بات دے قلم کو جو دل پر اثر کرے

"ساتھ نہ" کو ان دونوں دعاؤں کا ثمر کہا جا سکتا ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ سے بہترین سندھی ناول کا اعزاز پانے والا یہ ناول گزشتہ چالیس سال سے سندھی قارئین کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ حال ہی میں اس کا تلخیص شدہ ایڈیشن شائع ہوا جس کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

ان معروضات کے بعد محمد علی ڈیپلائی نے امر جلیل کا وہ تبصرہ دیا ہے جو اس وقت سے تعلق رکھتا ہے جب یہ ناول منظر عام پر آیا تھا۔ امر جلیل کا موقف ہے کہ:

"ڈیپلائی سندھ کے، گوشے گوشے میں جانا پہچانا جاتا ہے مگر پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں ان کو شاذ و نادر کوئی جانتا ہو۔

ہمارے بے حس معاشرے میں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مشرقی بنگال ربع صدی تک ہمارا حصہ تھا مگر کسی نے یہ بات جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ وہاں کس نوعیت کا بنگالی ادب تخلیق ہو رہا ہے۔"

امر جلیل کی یہ بات اختلافی ہے کہ بنگالی ادب سے باشعور اہل ادب بے خبر تھے۔ مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کے اسباب علمی وادبی اور لسانی وثقافتی کے ساتھ ساتھ سیاسی بھی تھے۔ بہرکیف ان کا یہ کہنا درست ہے کہ

''سانگھڑ سندھ کے حالات پر آج بھی اسی طرح معتبر ہے جیسے ۳۵ سال قبل۔ میری خواہش ہے کہ سندھی نہ جاننے والوں کے لیے اس کا اُردو اور انگریزی ترجمہ کیا جائے تاکہ سندھ کے حالات سے ناواقف حضرات کو سمجھنے اور سوچنے کے لیے مواد مل سکے۔ یہ ایک دکھ رے ٹائپ کا ناول ہے۔''

محمد علی ڈیپلائی نے شکوہ کیا ہے کہ:

''ہماری آزادی کی تاریخ میں حُر تحریک اور اس کے قائد کو بوجوہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ حکومت وقت اور طاقتور سیاسی اور انتظامی قوتوں سے اختلاف کی بناء پر قومی رہنماؤں کو نہ صرف نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ اکثر ان پر غداری کے الزامات بھی بے دریغ لگائے جاتے ہیں۔ سندھ کی ایک بہت بڑی سیاسی، ادبی اور علمی شخصیت جن کا حُر تحریک کی بیخ کنی میں اہم کردار سمجھا جاتا ہے، سانگھڑ کے پہلے ایڈیشن کے سرورق پر شہید پیر پگارو کی شبیہہ دیکھ کر بے اختیار بول اُٹھے'' واہ کیسا شیر مرد تھا۔''

''مگر جناب نے تو انہیں پھانسی پر لٹکوانے میں شاید اہم کردار ادا کیا تھا۔''

ڈیپلائی صاحب نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا

''یہ درست ہے ڈیپلائی صاحب! مگر شیر شکاری کے ہاتھوں مرنے کے بعد بھی شیر ہی رہتا ہے۔ مرے ہوئے شیر کے نزدیک جانے کے لیے بھی ہمت چاہیے''۔ ان صاحب نے بڑی فراخدلی سے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

شہید پیر پگارو کے خلاف سازشیں کرنے والوں کے سرغنہ کے یہ الفاظ ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں، مگر ہمارے پاس سوچنے والے ہیں کتنے؟ ''

اب میرے سامنے' سانگھڑ' کے مصنف یعنی ڈیپلائی صاحب کے سندھی پیش لفظ کا اردو ترجمہ

ہے۔ یہ پیش لفظ ۲۳ مارچ ۱۹۶۳ء کو سپردِ قلم کیا گیا تھا۔ اس کی تاریخی اہمیت وافادیت اور ناول سے اس کے موضوعی و معروضی تعلق کے پیشِ نظر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ قارئین تک اسے پہنچایا جائے لیکن جستہ جستہ۔ ڈیپلائی صاحب لکھتے ہیں:

"دنیا کے بہترین ادب کا بیشتر حصہ جیل میں اور خاص طور پر سختی والی سزا کے ماحول میں تیار ہوتا ہے۔" اس مشہور مقولے کے مصداق یہ ناول بہترین ہے کہ نہیں اس کا فیصلہ قارئین کریں گے لیکن میرا یہ پہلا ناول ہے جو سندھ کے حالات پر مبنی ہے اور ان چالیس دنوں میں لکھا گیا ہے جو میں نے حیدرآباد سنٹرل جیل میں گزارے کیونکہ دو سال پہلے کچھ تعصب پسندوں کی کوششوں سے مجھے ایک ایسے مضمون لکھنے کی پاداش میں مارشل لاء میں دھنسایا گیا جو مارشل لاء لگنے سے ڈیڑھ سال پہلے شائع کیا گیا تھا۔

چوروں، ڈاکوؤں، رہزنوں، بلیک میلروں، سمگلروں اور رشوت خوروں کو ضمانت پر رہا کیا جا رہا تھا لیکن ان حاکموں کو ایک غریب عیال دار ادیب کے لیے ضمانت منظور نہ تھی۔ ایک ہی وقت میں قاتلوں کو تو 'اے کلاس' دیا گیا تھا لیکن سوا سو کتابوں کے مصنف، متعدد پرچوں کے ۵۵ سالہ ایڈیٹر کو انہوں نے 'بی کلاس' دینے سے بھی انکار کر دیا۔ بقول ان کے ڈیپلائی کو مزہ چکھانا مقصود تھا لیکن ڈیپلائی کے لیے اس آگ میں بھی وہ پھول کھل گئے جن کی زینت اور مہک دل کو ہمیشہ تازگی بخشتی رہے گی۔ جیل میں آنے سے دو مہینے پہلے میری طرف سے اعلان کیا گیا تھا کہ یومِ آزادی کے موقع پر ہفت روزہ 'انسان' کا حریت نمبر شائع کیا جائے گا جس میں سندھ کی دوسری حر ہلچل کے ایسے حالات سے پردہ اٹھایا جائے گا کہ انگریزی پروپیگنڈہ کے باعث جن سے موجودہ نسل تو نابلد ہے ہی لیکن آنے والی نسل بھی سرکاری سرپرستی میں لکھی جانے والی کتابیں پڑھ پڑھ کر انہیں صرف خونخوار رہزن ہی سمجھتی رہے گی، جیسا کہ مشہور ہے کہ اس 'ہلچل' میں قید ہونے والے حروں کو دیکھنے کے لیے حیدرآباد کی کچھ نازک دل اور نازک طبع نوخیز لڑکیاں سنٹرل جیل پہنچیں۔ وہ سمجھی تھیں کہ وہاں افریقی، گوریلے سلاخوں کے پیچھے بند ہوں گے لیکن انہیں دیکھ کر اور بات کرنے

کے بعد حیرانی سے کہنے لگیں کہ 'ارے! یہ تو بالکل انسان ہی لگتے ہیں'۔ اس طرح یہ
خبر تھی کہ ہمارے امن اور ترقی کے علمبرداروں نے مجھے 'حریت نمبر' شائع کرنے سے ر
جہاں بھیجا وہاں بڑی تعداد میں 'حربی قید' تھے اور ان کے پاس کے کئی مذکور مستور تھے۔
انسانی فطرت کے مطابق مجھے بھی ظالمانہ طریقے سے 'سی' کلاس میں رہنا پ
محسوس ہو رہا تھا لیکن میرے لیے وہاں 'کام' نکل آیا۔ اس کے مدنظر میں تو یہی کہوں:

"کٹے جو سی کلاس زنداں میں شب و روز وہی حسین تھے زندگی کے"

میرا خیال ہے کہ اس مصنف کا مطالعہ مکمل ہی نہیں جس نے کچھ دن جیل کے 'سی
گزارے ہوں کیونکہ اپنے پرائے کے حال احوال ایک دوسرے کو جس قدر کھلے دل
قیدی کہہ سکتے ہیں غالباً کہیں اور نہیں بتا سکتے۔

میرے اسی جیل میں قیدیوں سے سن کر لکھے ہوئے افسانے کچھ 'مہران' سہ ماہی اور
'انسان' میں شائع ہو چکے ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد قارئین نے بھی محسوس کیا کہ جیل کا
سرکاری وقائع نگار خُردوں کو رہزن اور ڈاکو سمجھتے ہیں اور مصنف حضرات صرف مرشد
قربان کرنے والا تصور کرتے ہیں لیکن مجھے جو مخفی معلومات اس چالیس دن کے چلّے
الخاص خُردوں سے معلوم ہوئیں ان سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ:

یہ درد دل کی ہے وہ داستان طرب جس کو
کہیں موتی کہیں شبنم کہیں آنسو بھی کہتے ہیں

اس کے بعد والی عبارت میں انسان کی فطری آزادی اور اس آزادی کو سلب
طاغوتی قوتوں کا ذکر ہے پھر اس حقیقت کا اظہار کہ:

"دنیا کے تمام پیشوا، سالار، لیڈر جو انسان کو بنیادی انسانی حقوق مہیا کرنے کے
کرتے ہیں ان کے ارد گرد سب سے پہلے تو بڑی تعداد ان غریبوں اور مظلوموں کی ہ
انسانی بنیادی حقوق سے محروم ہوتے ہیں۔

ے وہ باشندے جنہیں 'حر' کہا جاتا ہے یا وہ جنہیں حر ٹھہرایا گیا وہ محض پیر صاحبان کی

وتو پیر صاحبان کے سندھ میں آنے سے پہلے بھی موجود تھے اور پیر صاحبان کی

وہ بھی موجود ہیں۔ پیر صاحبان میں سے کسی نے ان کو منظم کیا تو کسی نے اپنی جان

م آگ میں جھونک دیا۔

بات ہے کہ اس تحریک کا غیر جانبدارانہ اور گہری نظروں سے جائزہ لیا جائے نہ فقط

ں سے نئے بلکہ موجودہ نسل کے لیے بھی جو مکمل اور درست معلومات نہیں۔

سے بھی یہ احساس نہیں کہ ہمارے ملک سندھ کو تاخت اور مظالم کر کے غلام بنانے

انگریز کو اپنے پیارے وطن سرسبز سندھ سے دھکیل کر نکالنے کے لیے حقیقی

ف یہی ایک جماعت تھی جسے مجاہد سید احمد شہید نے منظم کیا تھا ان میں سے کچھ نے

انگریز اور ان کے حواری ظالم سکھوں سے خوب ٹکریں لیں اور کچھ ۱۸۴۳ء کے

میں بھرپور جانبازی سے لڑے اور پھر لڑتے ہی رہے۔

ویں صدی کے اواخر میں سوڈان کے چند خالی ہاتھ دلیر حریت پسندوں نے مجاہد محمد

ر سرکردگی میں صرف لاٹھیوں، کلہاڑیوں اور زنگ آلود تلواروں کے ساتھ انگریزی

ج سے ٹکر لی اور آج بھی دنیا پر حکومت کرنے والے انگریزوں کو اپنے ملک سے مار بھگایا

بھی ہمارے جانباز سندھیوں نے اپنے دلیر رہنما پیر بادشاہ کی سرکردگی میں ظالم

دانت کھٹے کر دیے تھے۔

ت تھی جو انگریزوں کی طرف سے آزادی دینے کے ارادے پر لگ کر جنگ عظیم میں

تھی لیکن انہوں نے کسی قیمت پر بھی کسی لالچ میں آ کر انگریزوں سے لڑنے والے

ہاتھ نہ اٹھایا اور نہ ہی حج کی نمازیں پڑھ کر خانہ کعبہ پر گولیاں برسائیں تھیں لیکن بعد

نگ ختم ہوئی اور انگریزوں نے آزادی دینے کی بجائے رولٹ ایکٹ جیسے وحشیانہ بل

ی دانہ دار مقدمات پر حیوانی قتل عام کیا اور جب اس کے جواب میں قطع تعلقات

کی ہلچل ہوئی تب بھی سندھ میں اس جماعت کے کئی افراد نے حصہ لیا تھا اور پھر جب مہاتما گاندھی
کی رہنمائی میں نمک کے نام پر سول نافرمانی شروع ہوئی اس وقت بھی انگریزوں نے اس جماعت
کے پیشرووں کو بیچ جھوٹے بہانے سے سندھ کے دور دراز علاقوں میں لے جا کر قید کر دیا تھا لیکن
انفرادی طور پر یہ جانباز مجاہد آزادی کی ہلچل میں حصہ لینے میں کبھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔

۱۹۴۲ء میں جب ملک بھر سے انگریزوں کو 'کوئٹ انڈیا' (ہندوستان خالی کرو) کے
پُر زور چیلنجوں کا سامنا تھا تب بھی یہ سندھ کے شیر ہی تھے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف ایک
منظم اور ہتھیار بند گوریلا جنگ شروع کی تھی اور ایک نہ دو بلکہ بتیس ہزار مجاہد شہید ہوئے، ہزاروں
کو جیل بھجوایا گیا۔ کروڑوں کی املاک تباہ ہو گئیں اور اپنی جانبازی کے باعث ہی سندھ میں مارشل
لا ء کا نفاذ کرایا۔

حروں کے محبوب پیشوا حضرت پیر صبغت اللہ شاہ شہید جنہیں سندھ کے مانے ہوئے لیڈر
جناب جی۔ ایم۔ سید نے اپنی کتاب میں 'مجاہد اعظم' اور رئیس الاحرار کہا ہے وہ مجاہد اپنی جوانی میں
۳۵ سال کی عمر میں ہنستا مسکراتا تختۂ دار پر پہنچا۔

سوري جنين سيج مرن تنِ مشاهدو

(موت ان کے لیے وسیلۂ دیدار ہے جو سولی کو سیج سمجھتے ہیں)

''اس قدر تباہی اور بربادی کے بعد بھی اس جماعت کے افراد چپ ہو کر نہیں بیٹھے بلکہ انگریزوں
سے ان کے مقابلے تب تک جاری رہے جب تک وہ ظالم و غاصب ہمارا وطن چھوڑ کر چلے نہ گئے۔

''ہماری نئی نسل کے ذہنوں پر کتنا بڑا ظلم کیا گیا ہے کہ ایسے مجاہد جن کی اکثریت روزہ، نماز،
زکوٰۃ، حج اور جہاد کی پوری طرح پابند ہو انہیں تو مجرم، رہزن اور ڈاکو بنا کر پیش کیا جائے اور جو
غیروں کے آگے وطن اور قوم کے نیلام ہونے پر مونچھوں کو بل دیتے رہیں انہیں بڑے طمطراق
سے رہبر کہا جائے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

''نئی نسل کے دماغ اور ذہن پر کئے جانے والے اس ظلم کے خلاف میں نے ۱۹۶۱ء میں اس ناول کا مسودہ ترتیب دیا اور ہفت روزہ 'انسان' کے حریت نمبر کا اعلان بھی کیا لیکن اس نمبر کو روکنے کی خاطر بعض ظالموں نے نہ صرف یہ کہ میرے جریدے پر پابندی لگادی بلکہ اپنے زعم میں مجھے تکلیف دہ ماحول میں جیل کے سی کلاس میں بند کروادیا۔ لیکن یہ قادر مطلق کی کرم فرمائی ہی تھی کہ وہاں اپنے کافی جانباز مجاہد حر مختلف الزامات کے تحت بند تھے جنہیں اس تحریک کے رازوں کی اندرونی طور پر مکمل معلومات حاصل تھیں اور ایسی کئی داستانیں ان کے سینوں میں چھپی تھیں جو کبھی اشاعت پذیر نہ ہوئی تھیں۔

بس پھر یوں ہوا کہ جس طرح پچھلے درویش سرکش نفس کو مطیع کر کے روحانی مرادیں حاصل کرنے کے لیے چلّہ کاٹتے تھے اسی طرح مجھے بھی ان تعصبی افسروں نے 'سی' کلاس کا چلّہ زبردستی کرایا جسے پورا کرتے ہوئے اس موزوں ماحول میں یہ ناول تیار کیا۔

ناول کے دستور کے مطابق اس میں سندھ کے ہاریوں کے حالات بھی دیے گئے ہیں جنہیں بڑھا چڑھا کر نہیں بلکہ اپنی زندگی کے پچیس سال میں جو میں نے مختلف زمینداروں کی ملازمت کے دوران غریب اور مظلوم ہاریوں کا حال کھلی آنکھوں سے دیکھا وہی بیان کردیا ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ اس ناول کے کافی کردار اب تک بقید حیات ہیں اس لیے نام تبدیل کردیے ہیں لیکن واقعات کو ہرگز بڑھا چڑھا کر نہیں پیش کیا گیا۔ کوئی دوست اگر ان کے صحیح نام اور پتے معلوم کرنا چاہے تو روبرو آکر معلوم کرسکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ہمارے وطن کے بہادر جانبازوں کے بارے میں جو زہرافشانی کی گئی ہے اس کے اثرات، یہ ناول ضرور رفع کرے گا۔ اس طرح کے میرے اور طبعزاد ناول وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہیں گے۔

یوم حریت ۔ ۲۳/ مارچ ۱۹۶۳ء

خاکپائے شہیدانِ وطن ۔ ڈیپلائی

'سانگھڑ' کے اردو ترجمے کو ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ملی اور تنقیدی تبصرے بھی ہوئے۔ تبصرہ نگاروں میں ایک مشہور و معروف نام پروفیسر ریاض صدیقی کا ہے، جو ترقی پسند تنقید کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ موصوف نے اپنے تنقیدی تبصرے کا آغاز ناول کے اس نقطۂ عروج سے کیا ہے، جب حُر تحریک کے قائد نے اپنی جان قربان کر دی مگر عزتِ نفس اور جذبۂ حریت پر کوئی حرف نہ آنے دیا۔

''محترم دوست! آج تمہارا وطن آزاد ہے جس وطن میں ایسے شیر پیدا ہوں وہ اب زیادہ عرصے تک غلام نہیں رہ سکتا۔''

ایک انگریز حاکم کے منہ سے یہ الفاظ اس وقت ادا ہوئے جب پیر صبغت اللہ شاہ پیر صاحب پاگارا نے اس کی منت سماجت کے باوجود معافی نامہ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا اور انگریزوں کی طرف سے دی گئی سزائے موت کا خوشی کے ساتھ سواگت کیا۔

کیسا المیہ ہے کہ آج بھی اس عظیم مجاہد کا وطن آزاد نہیں ہے اور اس کی قسمت کے فیصلے بین الاقوامی سامراج کی قوتیں (امریکہ، برطانیہ اور یورپی یونین) کرتی ہیں۔

ہماری پچھلی صدی میں برطانوی راج کے دوران انقلاب کے پرچارک، عوام دوست اور مجاہدوں کی ایک ایسی بھی خدا ترس علماء اور حق پرستوں کی اقلیت ہوا کرتی تھی جس نے اپنی نوآبادیاتی سامراج شکستی کے عوض اپنی زندگیوں کو جان جوکھوں میں ڈالا، قید و بند کی اذیتیں جھیلیں اور دار و رسن سے گزر کر جامِ شہادت نوش کیا مگر سانحہ یہ ہوا کہ اپنے چہروں پر ماسک چڑھائے ہوئے قوم پرست ہیروز نے جب اقتدار سنبھالا تو اپنے سامراجی آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اُن جانبازوں، مجاہدوں اور شہیدوں کے سیاسی و مزاحمتی کردار کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

سندھ کے سپوت، حُر تحریک کے قافلہ سالار، مجاہدِ اعظم پیر صاحب صبغت اللہ شاہ غیر سندھیوں کے لیے قطعی اجنبی ہیں۔

تاریخ کے اس اسی حقیقی تناظر میں خاکپائے' شہیدِ وطن محمد عثمان ڈیپلائی نے اس سچ کو رقم کیا ہے۔

یہ ناول سانگھڑ جو وحدت مغربی پاکستان (ون یونٹ) کے ایوب شاہی زمانے میں شائع ہوا تھا، تاریخ کے ان ہی گمنام حقائق اور سچائیوں کا بیانیہ ہے۔

ناول کا اُردو ترجمہ جوڑیا سوز ڈیپلائی نے کیا ہے اب تقریباً چالیس برس بیت جانے کے بعد شائع ہوا ہے لیکن دیر آید درست آید، کے مصداق انہوں نے ایک صاحب زبان کی طرح بڑی مہارت سے یہ ترجمہ کیا ہے۔

انسانیت کی فلاح و بہبود کا درد رکھنے والے مزاحمت کاروں نے تاریخ میں جب بھی ظالم حکمرانوں اوران کی حمایت کرنے والے اقلیتی طبقات کے خلاف نہتے اور بے سہارا غریب عوام کی اجتماعی قوت کو یکجا کر کے سماج کو بدلنے کے لیے جہاد کیا تو ظالم حکمرانوں اوران کے حمایتیوں نے ہمیشہ ان کو ڈاکو، رہزن، غدار، شرپسند اور مذہب دشمن ہی قرار دیا اور اپنے جملہ وسائل کی مدد سے اپنے اس مؤقف کو پروپیگنڈے کے ذریعے سر بلند کر کے عوام کو ورغلانے کا کردار ہی ادا کیا۔

ترقی پسند دانشوروں سے لے کر حضرت صبغت اللہ راشدی اور حسن ناصر کی شہادت تک اور محمد عثمان ڈیپلائی کو جیل میں بند کر کے انہوں نے وہی کچھ کیا جو فوجی طاقت پولیس اور جاسوسوں کے ذریعے ماضی میں ان کے سامراجی آقا کیا کرتے تھے۔

ناول میں جگہ جگہ اسی کے منظر اُبھرتے ہیں۔ پیر صاحب اور اس کے جانباز حُروں نے آزادی کی تحریک کو پایۂ تکمیل تک لانے والی کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے کردار کا تجزیہ نوآبادیاتی سامراجیت کے ساتھ ان کے تعلق کے تناظر میں کیا ہے۔ سندھ مسلم لیگ کے صدر جی۔ ایم سید کو وہ کہتے ہیں:

جو جماعت ہر قدم انگریزوں کے مشورے سے اُٹھائے اور جس جماعت میں 'سر'، خان بہادر، وڈیرے، اور سیٹھ شامل ہوں وہ اگر آزادی کا دعویٰ کرے تو اچھا مذاق ہے۔''

''پیر صاحب ہم تو جلد ہی اسمبلی سے پاکستان کی آزادی کی قرارداد بحال کروائیں گے۔'' جی۔ ایم سید نے کہا۔

پیر صاحب نے قہقہہ مار کر کہا "ٹھیک ہے انگریز تھالی میں آزادی رکھ کر آپ
گے ۔ایسا پاکستان ملے گا جس کی باگ ڈور برسوں انگریزوں کے پاس ہی رہے
اوراُن میں فرق ہے ۔کانگریس والے بھی بنیے اور انگریز بھی بنیے ان کی آپس میں
لیکن ہم مجاہدوں کے یہ دونوں دشمن ثابت ہوئے ہیں۔" جیل میں جب وہ معافی
سے انکار کرتے ہیں اور اُنہیں مشورہ دیتے ہیں کہ اہنسا کے فلسفہ کے مطابق انگریزوں
کرنی چاہیے۔لبرک بجھ سا گیا۔قدرے نرم آواز میں اُس نے پیر صاحب ۔
تو آزادی چھن جانے کا ڈر ہے نا۔ ہٹلر نے صاف اعلان کیا ہے وہ انگلینڈ کی س
کرنے کے بعد ہی دم لے گا۔"
"تو کیا ہوا؟ آپ کے سچے دوست مسٹر گاندھی کے مطابق انہیں قبضہ کرنے دیں
آپ ہی کی ہوگی۔"
پیر صاحب کا سیاسی تجزیہ نہ صرف ان کے زمانے میں صحیح تھا بلکہ ۱۹۴۷ء کے بعد
کی تاریخ اس کی سند ہے پھر بھی حُر تحریک انگریز سامراجیوں اوران کے حوار
شر پسندوں اور قتل و غارت گری کرنے والوں کی تحریک سمجھی گئی جس پر قابو پانے
حاکموں نے سندھ میں مارشل لا لگایا۔ پیر پگارا صاحب کو گرفتار کیا، جھوٹا مقدمہ
اور پھانسی کی سزا سنائی۔قائدِ حُریت نے جس شان کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا
سرمدِ شہید نے کہا ہے ۔

مدتے شدہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

ناول 'سانگھڑ' سندھ کے باسیوں کی سرفروشی کے اسی تاریخی زمانے کا بیانیہ ہے:
محنت کش حُروں کے دوش بدوش سندھی عورتوں کی بہت بڑی تعداد نے بھی اپنی مردا
کا بے مثال مظاہرہ کیا تھا وہ بھی ایک ایسے دور میں جب ترقی یافتہ جمہوری اور تعلیم

ورتوں میں بھی ایسی سرفروشی اور عسکریت (Militancy) کا تصور نہیں تھا۔
میئت پہلو پڑھنے والوں کے لیے یقیناً حیرت کا باعث ہوگا۔
، کے مزاحمتی نظام میں جاسوسی کا بھی ایک منظم نیٹ ورک تھا جس میں اُن عورتوں
؛ ذکراور اہم کردار ادا کیا تھا۔
ہے؟'' یہ مشہور حُر زینب ہے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے مجموعی طور پر
، ایک ہزار آدمی جہنم رسید کئے ہیں۔''
کارکردگی کی تفصیلات زمان و مکاں کے تناظر میں ناول کے کینوس پر پھیلی ہوئی ہے
ے اسلوب میں پیش ہوئی ہے۔
اتی اور انقلابی ناول ہونے کے باوجود سانگھڑ ادب کے فنی اور اسلوبی تقاضوں سے
ہے۔ اس کے پہلے ہی پیراگراف میں ڈیپلائی صاحب نے سندھی ہاری اور وڈیرے
ماد اور طبقاتی کھینچا تانی کا جو سچا اور کھرا منظر دکھایا ہے اور جواب بھی آپ سندھ کے
جا کر دیکھ سکتے ہیں، ادبی انشاء پردازی کا نمونہ ہے۔ اس میں ایک نیم داستانی

میر امن نے چار درویشوں کی وساطت سے اپنی کہانی بُنی ہے۔ اسی طرح ناول نگار
ں حُر مردوں اور عورتوں کے کرداروں کی وساطت سے پیر صاحب اور خود اپنے
ندیسے کا روپ دے کر آج کی نسلوں کے ذہنوں کو واڑ کھٹکھٹائے ہیں۔
ی کی پہلی پوسٹ کالونیل ترقی پسند تخلیق ہے۔ یہ ناول سندھ میں برطانوی سامراج
ن جارحیت اور اس کے خلاف حُر مردوں اور عورتوں کی منظم مزاحمتی تحریک کے سیاسی
، مذہبی اور اقتصادی مؤقف کو پوری صحت و سند کے ساتھ پیش کرتا ہے جس کی
حمد شہید کی تحریک جہاد سے ہوئی تھی۔
کے دیس پر یمی کردار عقائد کے امتیاز پر یقین نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ پیر

صاحب کے بہت سے عقیدت مند ہندو بھی تھے کیونکہ غازی بننے کے لیے مرید ہونا شرط نہیں تھا نہ ہی کسی قوم کی شرط ہے اور نہ مرد یا عورت ہونے کی۔ یہی وجہ ہے کہ سیٹھ تنولمل اپنا سب کچھ لٹا کر اس مسلح مزاحمتی تحریک سے آخر وقت تک وفاداری بشرطِ استواری کا عہد پورا کیا حالانکہ بیشتر ہندو مسلمان وڈیرے، حکام، سیٹھ اور بیوپاری جن میں آزادی کے لیے سرگرم مجاہدوں کی بھی کمی نہیں تھی پیر صاحب اور ان کی مزاحمتی تحریک کے خلاف برطانوی حکام کے مؤقف کے حامی رہے اور ان کو اہم اطلاعات فراہم کرتے رہے۔ یوں ناول نے تاریخ کا وہ باب جو اپنی اصلی صورت میں ابھی تک نہیں لکھا گیا تھا اب مکمل کر دیا۔ اس میں بنیادی کردار خدا ترس اور طاہر ہیں مگر بجائے خود بے رحم، ظالم اور برطانوی سامراج کا حاشیہ بردار وڈیرہ حاجی محمد عارف ہے جس کے ظالمانہ سلوک کے ردِعمل میں اس کا مظلوم ہاری معصوم سرفروش مجاہد بنا اور حر تحریک میں اپنا کردار ادا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ

ہم اکیلے چلے تھے جانبِ منزل مگر
ہمسفر آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

(مجروح سلطان پوری)

ناول نگار کے اپنے ادبی و شعری ذوق کی پختگی کا اندازہ تو ان سندھی، اردو اور فارسی اشعار سے ہی ہو جاتا ہے جو موقع کی مناسبت سے بیانیہ میں شامل کئے گئے ہیں۔

ہمارے ہم خیال مؤرخ اور دانشور ڈاکٹر مبارک علی نے ناول کے دیباچے میں بڑے اختصار کے ساتھ ناول کے موضوع کا احاطہ کیا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ "ناول نگار اپنے تخیل کی بنیاد پر ماضی کو زندہ کر دیتا ہے۔ تاریخی ناول اگر اپنی ساخت اور ہیئت (form) میں مکمل ہوتے ہیں تو یہ قارئین کو تاریخی شعور فراہم کرتے ہیں۔" 'سانگھڑ' نے یقیناً یہی فریضہ انجام دیا ہے۔ تاریخی ناول نگاری کی اُس رومانی روایت کے برعکس جو عبدالحلیم شرر نے قائم کی تھی۔ ناول کے کرداروں اور رزم و بزم کے لٹو کی کیل پیر صاحب پگارا کی سامراج شکن شخصیت ہے جو سامراجی سیاست

کے جدید رجحانات اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے واقعات مثلاً دوسری عالمگیر جنگ اور آئرلینڈ پر برطانوی تسلط وغیرہ سے پوری طرح آگاہ تھے۔

پیر صاحب کو شہید کرنے کے بعد انگریزوں نے ان کی گدی کا بھی خاتمہ کر دیا ان کے دو بیٹوں کو لندن بھیج دیا گیا، جہاں انگلستان کے ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت کا اس طرح اہتمام ہوا کہ ان کے ذہن اور شعور نو آبادیاتی ہو جائیں۔

اس طرح وہ تاریخ جس نے پیر صبغت اللہ کو شہید بنایا تھا اور پھر وہ تاریخ جو خود شہید نے بنائی تھی ان ہی کے ساتھ ختم ہوگئی اور اب ناول نگار محمد عثمان ڈیپلائی یہ سندیسہ دے کر چلے گئے کہ ؎

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک کہ ستم کی سیاہ رات چلے

ناول کا یہ رخ بھی عجیب ہے کہ اس کا اختتام ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے ہجرت کر کے سندھ میں آباد ہونے والوں پر ہوا ہے اور ناول نگار نے اُن کو حُر تحریک کا ہمنوا بنا دیا ہے۔نواب شاہ میں ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجر جب کیمپ کے باہر 'حُر' کا لفظ دیکھ کر پریشانی کا اظہار کیمپ کے ڈاکٹر سے کرتے ہیں تو ڈاکٹر پوچھتے ہیں:

''گزشتہ دنوں سے جو سندھی بھائی آپ کی خدمت کر رہے ہیں، اُن کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' ''وہ تو صاحب! رحمت کے فرشتے ہیں۔''

ڈاکٹر نے پھر ہنس کر پوچھا

''اور دو دن سے جو کھانا آپ کھا رہے ہیں، وہ کیسا تھا؟''

''بے حد لذیذ اور صحت بخش تھا۔''

''وہ کھانا بھی حُروں کی طرف سے تھا اور وہ خدمتگار بھی حُر ہی ہیں۔''

''لیکن صاحب! ہم تو ہندوستانی اخباروں میں یہی کچھ پڑھتے رہتے تھے کہ حُر ڈاکو، خونی اور رہزن ہیں۔''

''بس خرتو یہی ہیں'' ڈاکٹر صاحب نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''رہزن سمجھیں، یا شریف کھانا تو آپ اُن کا کھا ہی چکے ہیں''۔ مہاجروں نے یہ سب کچھ سن کر ڈاکٹر صاحب کو جواب دیا۔

''صاحب! یہ تو بڑے نیک، نمازی اور ہمدرد انسان ہیں، ان سے تو ہماری دوستی تا حیات رہے گی۔'' کاش وہ اپنے اس نیک جذبے کا ثبوت پیش کرتے۔ پھر بھی آس کا دامن چھوڑنا نہیں چاہیے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے بالکل صحیح رائے دی ہے'' مزاحمت کا یہ سبق سندھی اور اردو دونوں طبقوں کے لیے انتہائی ضروری ہے۔''

راقم الحروف نے اس ناول کو سندھی میں چالیس برس پہلے پڑھا تھا اور ڈیپلائی صاحب کی اجازت سے اسے قسط وار اردو میں ترجمہ کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا لیکن دو تین قسطیں ہفت روزہ اخبار جہاں میں اشاعت کے لیے بھیجیں بھی تھیں لیکن وہ دور ہی کچھ ایسا تھا کہ اشاعت سے محروم رہیں بہرکیف جب محمد علی ڈیپلائی نے اپنی بہن ڈاکٹر ثریا سوز کا کیا ہوا ترجمہ مجھے نظر ثانی کے لیے عنایت کیا تو بڑی خوشی ہوئی۔ خیر سے ڈاکٹر مبارک علی کی آشیرباد بھی اسے حاصل ہوگئی اور فکشن ہاؤس لاہور سے ۲۰۰۲ء میں اس کی اشاعت ہوگئی۔

میرا خیال ہے کہ اُردو میں جو ناول ترجمہ کئے گئے ان میں' سانگھڑ' کی بڑی منفرد تاریخی حیثیت ہے اور بلا خوف و تردید یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ عظیم ناول سندھ کے تہذیبی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی پس منظر کا پیش منظر ہے۔ سندھ اور اہلِ سندھ کے علمی و فکری تسلسل کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ جلد ہی اس کی اشاعت ثانی کا حق ادا کیا جائے کیونکہ فی الوقت شائقین و قارئین کو یہ دستیاب نہیں ہو رہا ہے۔

ہر چند کہ اُردو میں ڈیپلائی جیسی یگانۂ روزگار شخصیت کے کارناموں پر جتنا لکھا جانا چاہیے ابھی اس میں خاصی کمی ہے تاہم جو تحریریں نظر نواز ہوتی رہی ہیں ان کا حوالہ کچھ یوں ہے۔

جناب محمود شام روزنامہ جنگ کے ایڈیٹر اور مشہور شاعر و ادیب ہیں۔ انہوں نے ۷ فروری

۲۰۰۰ء کو ڈیپلائی صاحب کی برسی پر منعقدہ مجلس مذاکرہ میں ایک مختصر مگر دلچسپ مضمون ''ڈیپلائی ایک صحافی اور مجاہد ادیب'' کے عنوان پر پڑھا تھا جس کے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

''میں ۳۰ سال کی گرد ہٹاتا ہوں تو کچھ دھندلی دھندلی تصویریں اُبھرتی ہیں۔ یہ شاید ۱۹۶۹ء۔ ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۱ء کا دور ہے جب ہم صحافیوں کی ایک ملک گیر ہڑتال میں حصہ لینے کی پاداش میں ہفت روزہ اداکار جہاں سے نکال دیے گئے تھے۔ کچھ دوستوں نے مل کر ہفت روزہ 'افق' جاری کیا تھا۔ اس ہفت روزہ کے دفتر کی بعض تقریبات میں یاد پڑتا ہے ایک مشفق و مہربان چہرہ قراقلی کی ٹوپی عینک کے شیشوں سے جھانکتی تجسس آنکھیں جو ایک سمندر لگتی تھیں۔

ہمارے اور ان کے درمیان زبان کا فاصلہ تھا، برسوں کی دوری تھی، علم و فضل کا فرق تھا لیکن وہ ایک شفیق کی طرح ہماری انگلی پکڑ کر ہمیں اس طویل راہ پر چلنے کا حوصلہ دے رہے تھے جو انہوں نے کافی عرصے سے اختیار کر رکھا تھا۔

یہ راستہ جس منزل کی طرف جاتا تھا وہ اب بھی دور ہے۔ یہ راہ اس تضاد کا اظہار کرتی تھی جو اب بھی موجود ہے۔ یہ آواز جن مظالم کے خلاف تھی وہ اب بھی سندھ اور دوسرے علاقوں میں توڑ رہے ہیں۔

یہ مزاحمت جن انسانیت دشمنوں کے خلاف تھی وہ آج بھی انسانی اُمنگوں، آرزوؤں اور عزت نفس کو کچل رہے ہیں۔ انھیں آمر کہہ لیں، جاگیردار نام رکھ دیں، حقارت سے وڈیرا پکاریں، سیٹھ لقب دے دیں۔ اب آپ چونکہ گلوبل ویلج میں ہیں اس لیے اسے سپر طاقت کہہ لیں۔ انسان اسی طرح کرب میں مبتلا ہیں۔ انسانیت اسی طرح چیخ رہی ہے لیکن، اب اس راستے پر آنے والے نئے لوگوں اور نئی نسلوں کی انگلی پکڑ کر رہنمائی کرنے والے عثمان ڈیپلائی نظر نہیں آتے۔

جن کی انگلی پکڑ کر انہوں نے چلنا سکھایا وہ ہماری طرح مصلحتوں کا شکار ہو کر سرکاری اور نجی اداروں میں اعلیٰ عہدوں کو اپنی منزل سمجھ کر اصل منزل بھی بھلا بیٹھے ہیں۔ نئے ملنے والوں کی انگلیاں جو ہمارے ہاتھوں میں آنے کے لیے بے تاب ہوتی ہیں ہم ان کی طرف اس وقت تک

نہیں دیتے جب تک وہ انگلیاں ہماری طرف اٹھنے نہیں لگ جائیں۔''

ڈیپلائی صاحب کی افسانہ نگاری اور ناول نویسی کے حوالے سے محمود شام لکھتے ہیں:۔

''سندھ میں اسلامی ناولوں، کمال اتاترک اور افریقہ وایشیا کے حریت پسندوں کی جدوجہد پہ مبنی داستانوں کے ذریعے اہل سندھ کے دلوں میں آزادی کا شعلہ بھڑکانے والے اور قیام پاکستان کے بعد استحصالی طبقوں کے خلاف اپنی طاقت اور اسلوب بیاں کے ذریعے بیداری پھیلانے والے جناب عثمان ڈیپلائی سے ہماری طویل نشستیں تو نہیں رہیں لیکن کبھی کبھی سر راہ ملاقاتوں میں ان کے جو بھی جملے سننے کو ملتے وہ ہمارے لیے روشنی بن جاتے۔

اہل سندھ کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں ڈیپلائی صاحب جیسے ادیب، صحافی، سیرت نگار اور شاعر ملے جنہوں نے انتہائی بھرپور زندگی گزاری، اس کا ایک ایک لمحہ اپنے اہل وطن کو زندہ رکھنے، بیدار کرنے اور ان کے شعور میں اضافہ کرنے میں گزارا۔

محمد عثمان ڈیپلائی یقیناً جنوبی ایشیا کے عظیم ادیبوں میں سے ہی نہیں بلکہ اس خطے کے ریفارمرز میں سے تھے جو معروضی حقائق و زمینی حقیقتوں کو بھی نظر میں رکھتے ہیں۔ قوت تخیل کو بروئے کار لاتے ہیں الفاظ پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دلوں میں اتر جانے کا فن سونپا ہوتا ہے''۔

اب ایک اور معروف شخصیت جناب محمد زماں کے تاثرات کی کچھ جھلکیاں۔ موصوف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:

''وادیٔ مہران کے عظیم قلمکار محمد عثمان ڈیپلائی کی پوری زندگی جہد مسلسل کی مظہر اور آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ وہ مذہب کے شیدائی، عجز وانکسار کا پیکر، خلیق، ملنسار، نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز کی زندہ تفسیر

انہوں نے قلم سے ملک وقوم کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ ان کی انقلابی اور ہمیشہ زندہ رہنے والی تحریریں، قابل فخر، قابل تقلید اور حقیقت پسند عملی زندگی کے لیے تاثر دیتی ہیں۔

وہ زندگی بھر ظالم اور غاصب حکمرانوں، جعلی پیروں، نام نہاد ملاؤں اور قوم دشمن ساہوکاروں

اور زمینداروں سے نبرد آزمار ہے اور جس کی پاداش میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔

انہوں نے اپنی تصانیف اور کردار سے ہمیں ایسا راستہ دکھایا جس پر چل کر ہم زندگی میں نہ صرف کامرانی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں بلکہ اپنی منزل پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔

وہ بیک وقت مبلغ، مُفکّر، مقرّر، ادیب، صحافی اور شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی تمام خداداد صلاحیتوں اور توانائیوں کو پوری زندگی ملک و قوم خصوصاً سندھ کے مظلوم عوام کی خدمت کے لیے استعمال کیا، وہ انسانیت کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔

انہوں نے اپنے کردار اور عمل سے یہ ثابت کردیا کہ ان کے قول و فعل میں کبھی کوئی تضاد نہیں رہا۔ وہ دوسروں کو جو تلقین کرتے تھے اس پر خود بھی عمل پیرا رہے۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کے تین صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں اپنے عظیم باپ کا اتباع کرتے ہوئے کامیاب زندگی کی راہ پر گامزن ہیں۔

محمد زماں صاحب کا مضمون سوانحی لحاظ سے اور اپنے ممدوح کے کارناموں کی قدر و منزلت کے طور پر لائق تحسین ہے۔

ایک اور قابلِ قدر مضمون جناب ظہیر احمد کا تحریر کردہ میرے زیرِ مطالعہ آیا جس کی نوعیت قریب قریب وہی ہے جو محمد زماں صاحب کے مضمون کی ہے۔ تاہم اس مضمون سے کسب فیض کرتے ہوئے چند اقتباسات حاضر ہیں جو ڈیپلائی صاحب کے تصنیفی کارناموں سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً یہ کہ:

''ڈیپلائی صاحب کی پہلی کتاب قرآنی دعائیں ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر ان کے نام کے ساتھ ڈیپلائی چھپا اور ہمیشہ کے لیے ان کی ذات کا تعارف بن گیا۔ ان کی آخری کتاب 'انقلاب ایران' ہے۔ یہ حُسنِ اتفاق کہ پہلی کتاب پر بھی انعام ملا اور آخری کتاب پر بھی۔

انہوں نے آریہ سماجی ہندوؤں کی مسلمان دشمنی کے خلاف زبردست قلمی جہاد کیا اور مولانا عبدالحلیم شرر اور دوسرے مصنفین کے تاریخی اسلامی ناولوں کو سندھی کے قالب میں ڈھالا۔ ان کا ناول 'ذاہری رنگ محل' آریہ سماجی پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب تھا۔ ۱۹۴۱ء میں جب تحریک آزادی

نے زور پکڑا تو ڈیپلائی صاحب اس کے لیے مصروف عمل ہو گئے۔ آج کا سب سے کثیر الاشاعت سندھی روزنامہ 'عبرت' ڈیپلائی صاحب کا ہی جاری کردہ ہے جسے انہوں نے ۱۹۴۱ء میں پہلے ماہانہ کتابی سلسلے کی حیثیت سے پھر ہفت روزہ کے طور پر جاری رکھا اور جو آخر کار روزنامہ بنا۔

انہوں نے سندھ کے پیروں، فقیروں اور مرشدوں کے خلاف زبردست قلمی جہاد کیا۔ وہ ان مذہبی رہبروں کے خلاف اپنی پیرانہ سالی تک برسرِ پیکار رہے جو رہبری کے نام پر گمراہی کا سمندر ہیں۔ انہیں بڑھاپے میں اسی سلسلے کی ایک کتاب 'شیخ المشائخ' لکھنے پر حوالات بھی جانا پڑا۔

ڈیپلائی صاحب کے ساتھ میری اُلفت و محبت کا سبب یہ تھا کہ وہ زندگی کے نازک ترین معاملات کو بچوں کی طرح برتنے کے عادی تھے۔ ہر وقت لطیفہ گوئی، جملے بازی اور ہر حال میں خوش رہنے کی ادا ان کی شخصیت کا حصہ تھیں لیکن کسی کی دل شکنی نہ کرتے۔''

ظہیر احمد نے اپنے مضمون میں محترمہ ثریا سوز کے اُس یادگار انشائیہ کا بہت ہی اثر انگیز اقتباس بھی پیش کیا ہے جو ڈیپلائی مرحوم کی دوسری برسی پر روزنامہ جنگ میں شائع ہوا تھا۔ اس کا خوبصورت ابتدائیہ کچھ یوں ہے کہ:

'' میرے اردگرد بہت سے رسالے ہیں اور ہاتھوں میں ہفت روزہ 'انسان'، حیدرآباد ۳ رمئی ۱۹۵۹ء کو شائع ہونے والا ایک پرچہ جس پر 'شہید انسانیت' نمبر لکھا ہوا ہے۔ یہ پرچہ سندھ کے مشہور ادیب وصحافی محمد عثمان ڈیپلائی صاحب کے زیرِ ادارت شائع ہوتا تھا اور بے حد مقبول تھا۔

مرحوم لکھتے ہوئے نہ جانے کیوں دل بھر آیا اور یوں لگتا ہے کہ آنسو چھلکنے کو ہیں لیکن نہیں! میں ان اشکوں کو گرنے نہ دوں گی کیونکہ جن کے بارے میں آج لکھ رہی ہوں وہ اس دن بھی نہ روئے جب ان کی دو بیٹیوں فاطمہ اور ثریا کی اور ایک بیٹے محمد علی کی شادی تھی لیکن وہ خود سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند تھے۔ ان کی شریک حیات (ہماری قابل فخر والدہ) بیگم سکینہ ڈیپلائی نے خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی تین بچوں کو بیاہ دیا اور اس وقت تو سب ہی روئے تھے جب رخصتی کے وقت میرے بابا کو چند گھنٹوں کے لیے گھر آنے کی اجازت ملی اور انہوں نے روایت کے برخلاف

بیٹیوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "مسکراتی ہوئی جاؤ اور مسکراتی ہوئی آنا"، نہ خود روئے نہ ہمیں رونے دیا۔ کیسے تھے ان جیسے ماں باپ ہے؟

بہو نے جب بیٹے کے گھر قدم رکھا تو بیٹے اور بہو کو پھولوں کا گلدستہ پیش کرتے ہوئے کہا ہمیشہ پھولوں کی طرح کھلتے اور مہکتے رہو۔"

ڈاکٹر [illegible] کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ ڈیپلائی صاحب کے منتخبہ افسانوں، ڈراموں اور مضامین کو اردو ترجمے کی صورت میں پیش کریں لیکن افسوس کہ صرف چند افسانوں اور شاہکار ناول کا اردو ترجمہ کرنے کے بعد وہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئیں۔ اب یہ ذمہ داری ہر باشعور اردو ادیب کی ہے کہ سندھی ادب کی ایسی نگارشات کو اردو میں منتقل کرنے پر توجہ دے جو انسانیت نوازی کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہ ذمہ داری ان سندھی اہل قلم پر بھی نسبتاً زیادہ ہے جو اردو میں لکھنے کی مہارت رکھتے ہیں۔ بہرکیف میرے چند شاگردان عزیز میں محبی مظہر جمیل اور [illegible] جیسے باصلاحیت قلمکار اس کام پر خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔

مظہر جمیل کا قابل قدر کارنامہ آشوب سندھ اور اردو فکشن کے بعد جدید سندھی ادب، میلانات، رجحانات اور امکانات کے نام سے ۵۸۴ صفحات کی ضخیم کتاب کے طور پر اکتوبر ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آ چکا ہے اور ادبی دنیائے ادب میں بے پناہ مقبولیت بھی حاصل ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ڈیپلائی صاحب کے ڈراموں کا حوالہ ۲۹۵ صفحے پر دیا گیا ہے۔ عبارت درج ذیل ہے:-

"۱۹۳۲ء-۵۲ء کے عرصے میں محمد عثمان ڈیپلائی نے نئے انداز کے ڈرامے لکھے جنہیں عوامی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ ان کے لکھے ہوئے ڈرامے نور جہاں جو پٹ، سچائی سوڑی اور کانگریس اپنے وقت کے نہایت مقبول اور پسندیدہ ڈرامے تھے۔ ان میں سماجی حقیقت نگاری بھی تھی اور طنز ومزاح کی چاشنی بھی۔"

حال ہی میں پروفیسر طلعت جمیل نے ڈیپلائی صاحب کی شخصیت اور کارناموں پر تحقیقی وتنقیدی مضمون نگاری کا آغاز کیا ہے۔ محترمہ کی مادری زبان اردو ہے لیکن اوائل عمری سے اب تک سندھی

کتابیں بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھتی رہتی ہیں۔ سندھی بولنے اور لکھنے کی مہارت بھی ہے۔ کراچی کے ایک گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج میں اسلامیات کے شعبے سے وابستہ رہیں اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد تصنیف و تالیف اور تراجم کے مشاغل کو اپنایا ہے۔ ڈیپلائی صاحب کے ناول 'سانگھڑ' اور نور توحید نے اتنا متاثر کیا کہ اپنے طور پر ایک کتاب لکھنے کا آغاز کر دیا ہے۔ فی الوقت سرسید یونیورسٹی کراچی کے شعبۂ اسلامیات سے وابستہ ہیں ان کے خیال میں:

''ڈیپلائی صاحب علم و ادب کا بحرِ ذخار تھے۔ نوکِ قلم بے چین اور مضطرب ہے کہ کس زاویے سے لکھا جائے اور کیا لکھا جائے۔ سندھ کی تاریخ، تہذیب و ثقافت اور سماجیات پر ڈیپلائی صاحب بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور انتہائی شستگی سے خوبصورت جملوں کی ادائیگی موصوف کی طبیعت کا خاصہ رہی۔

اس ہمہ صفت شخصیت نے ادب و صحافت کی مختلف جہتوں اور زاویوں سے اپنے آپ کو منوایا تاہم ناول نگاری جو افسانوی ادب کی اہم ترین صنف ہے اس میں 'سانگھڑ' جیسا نیم تاریخی ناول لکھ کر موصوف نے سندھ کی سرزمین کے حریت پسندوں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ یہ اپنے محبوب وطن کی آزادی کے لیے جانوں کی بھی قربانی کا درس دیتا ہے''۔

سانگھڑ کے اردو ترجمے پر ایک اور تبصرہ جناب عاصم شیخ کا تحریر کردہ میرے سامنے ہے جس میں تبصرہ نگار کا کہنا ہے کہ:

''سانگھڑ روایتی ناول نہیں ہے بلکہ تاریخ کو ناول کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ اس میں وہ سچائی ہے کہ پڑھنے والا جب تک اسے مکمل نہ پڑھ لے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔

اس ناول میں حُر تحریک کے نشیب و فراز کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ سندھ دھرتی کے سچے، کھرے اور مظلوم لوگوں کے ایثار اور جذبۂ قربانی کی داستان جو دلوں میں جرأت کردار کو تقویت دیتی ہے مگر غداروں اور آستینوں کے سانپوں کا ذکر اشاروں اور علامتوں کے پردے میں کیا گیا ہے۔ ناول میں سب سے اہم پہلو سندھ کی غیور اور ثابت قدم خواتین کا مجاہدہ ہے جس قوم کی ماں،

بہنیں اور بیٹیاں ایسی بہادر ہوں تو وہاں پر جنم لینے والے بچے وطن پرست ماؤں کی گود میں پل کر محبِ وطن کیوں نہ ہوں گے"۔

(ب) انگریزی تبصرے

ڈیپلائی صاحب کی شخصیت اور ادبی وصحافتی کارناموں پر انگریزی میں بھی کافی کچھ لکھا گیا جس کا پورا اعادہ توفی الوقت مناسب نہ ہوگا البتہ چند اہم تحریروں کا حوالہ ضروری ہے۔ مثلاً محترم سراج الحق میمن سندھی زبان وادب کے ایک ممتاز نقاد اور دانشور ہیں جو انگریزی میں بھی تنقیدی مضامین لکھتے رہے ہیں۔انہوں نے ڈیپلائی صاحب کی چند تصانیف اور خصوصاً 'سانگھڑ' ناول کی اہمیت وافادیت کا تجزیہ اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جس کا عنوان Saga of the Heroic Hur Movement ہے۔اس مضمون میں سراج صاحب نے پہلے تو ٹوئن بی اور کئی دوسرے مغربی دانشوروں، مفکروں اور مؤرخوں کے کارناموں کا حوالہ دیا ہے پھر سندھی ادب کے حوالے سے مرزا قلیچ بیگ کے بعد عثمان ڈیپلائی صاحب کو سندھی ادب کا Monument قرار دیتے ہوئے تصانیف کی تعداد اور موضوعی ومعروضی حقائق کے لحاظ سے سندھی زبان کا Significant صاحب قلم بتایا ہے علاوہ ازیں ان کی ادبی وصحافتی خدمات کی بناء پر ان کو سماجی مصلح (Social Reformer) تصور کیا ہے کیونکہ انہوں نے افسانوی ادب اور موضوعاتی مضامین میں سندھ کی تہذیب وثقافت اور سندھ کے باشندوں کے تناظر میں اصلاحی نقطۂ نظر کو اہمیت دی ہے۔

جس زمانے میں ڈیپلائی صاحب نے لکھنا شروع کیا وہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد کا زمانہ تھا جب Pan-Islamism کی تحریک عالم اسلام کی عملی وفکری بیداری پر غالب تھی لہٰذا اسلامی جذبہ ڈیپلائی صاحب کی ابتدائی تحریروں پر بھی غالب رہا لیکن آخری دور کی تحریریں کیا ظاہر کرتی ہیں اس بارے میں سراج الحق میمن کی رائے ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

"He started as a rabid Pan-Islamist and ended up as the most important rationalist of his time"

تبصرہ نگار نے اگلی عبارتوں میں ایک Rational Man کے طور پر ڈیپلائی صاحب کے ان تصنیفی کارناموں کا ذکر کیا جو سرزمین سندھ اور اہل سندھ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کے بارے میں سندھی اور اردو کے اہل قلم نے بھی بہت کچھ لکھا ہے جس کا اندازہ قارئین کو بخوبی ہو گیا ہوگا کہ شدید مزاحمت کے قلمی جہاد میں وہ کتنی بے باکی اور بے خوفی سے اپنی عمر عزیز کے آخری لمحوں تک پیش پیش رہے۔ خصوصاً انگریزی سامراج کے خلاف حُر تحریک کے نشیب و فراز پر ان کا ناول 'سانگھڑ' ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے جس کی تعریف و توصیف میں سراج صاحب لکھتے ہیں:

It is not only a work dedicated to Sindhi nationalism, but also a piece of art Diplai has woven a magnificent tale of courage, ceviction, sacrifice and rustic warfare.

جناب سراج الحق کا یہ تبصرہ انگریزی روزنامہ 'ڈان' میں شائع ہوا تھا۔ اسی نوعیت کا ایک قابل ذکر مضمون لاہور کے ایک معروف صاحب قلم قاضی جاوید کا تحریر کردہ انگریزی روزنامہ The News میں ۱۱؍اگست ۲۰۰۲ء کو شائع ہوا۔ عنوان تھا:

"Fighting the Empire"

قاضی جاوید نے ابتدائی حصے میں ڈیپلائی صاحب کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ایسی مثالی ادبی شخصیت سے پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے لوگ آشنا نہیں ہیں۔

سوانحی حالات بیان کرنے کے بعد تبصرہ نگار نے ڈیپلائی صاحب کی ناول نگاری کے ارتقاء کا احوال رقم کیا ہے اور اس سلسلے میں 'سانگھڑ' کو نقطۂ عروج قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"Sanghar' gave a boost to Sindhi nationalism. Its message to the people of Sindh was loud and clear: rights are never secured without hard struggle and resistance."

انگریزی میں ایک اور قابل قدر مضمون جناب طارق عزیز سندھو کا ہے جس کی اشاعت

روزنامہ "The Nation" میں ۷راگست ۲۰۰۲ء کو ہوئی ۔ عنوان ہے اس مضمون کا "When the Hurs Rebelled" ظاہر ہے کہ اس عنوان کا تعلق بھی 'سانگھڑ' سے ہے تاہم ابتدائی حصے میں مضمون نگار نے اس تلخ حقیقت کا اظہار کردیا ہے کہ:

"History written under the spell of 'colonialism' is not more than a distorting mirror."

قاضی جاوید کی طرح طارق عزیز سندھو کا مضمون بھی 'سانگھڑ' کے اُردو ترجمے کو پڑھ کر لکھا گیا اور اسے بنیادی طور پر ایک تبصرہ ہی کہنا مناسب ہے جیسا کہ تحریر سے بھی ظاہر ہے کہ:

"The under review novel 'Sanghar' records the stunning details of one of such forgotten chapters of our history"

اس عبارت کے بعد تبصرہ نگار نے انھیں حقائق کا حوالہ دیا ہے جو تاریخی تناظر میں حُر تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔

تبصرہ نگار کی تحریر کا اختتام جس عبارت پر ہوا ہے اس کا آخری حصہ بڑا جاندار ہے۔

" On being a thorough analysis of the political, social, and historical currents of Sindh's life, 'Sanghar' can be enjoyed on multiple levels. The translation of the novel maintains the ebb and flow of the Sindhi language and the reader shares the delight of Sindhi folk wisdom in a captivating way."

جناب کریم بخش خالد جو حکومت سندھ کے محکمۂ اطلاعات کے اعلیٰ افسر رہے اور ڈائریکٹر جنرل کے منصب تک پہنچے، بذاتِ خود اردو، سندھی اور انگریزی میں مضامین لکھنے میں بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔ انہوں نے ڈیپلائی صاحب پر تینوں زبانوں میں خامہ فرسائی کی ہے ۷رفروری ۱۹۹۱ء کو روزنامہ 'ڈان' میں ان کا جو مضمون شائع ہوا تھا اس کا عنوان ہے:

"Muhammad Usman Diplai, A Bold Freedom Fighter"

اس مضمون میں قائداعظم کی قیادت، تحریکِ آزادی، قیامِ پاکستان اور ڈیپلائی صاحب کے تصنیفی

کارناموں کے حوالے سے تاریخی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"Diplai will be remembered on Sindhi hislory for the scathing criticism of the Pirs, Mirs, feudal land-lords and the so-called religious guides, the Mulias who had been exploiting the poor and simple masses."

اسی عبارت کے تسلسل میں وہ مرحلہ بھی آتا ہے جب سندھ ہاری تحریک زور پکڑتی ہے اور ڈیپلائی صاحب کی تحریریں بھرپور حمایت کرتی نظر آتی ہیں۔ پھر ون یونٹ کے خلاف سندھ کے دانشوروں نے جو تحریک چلائی اس میں موصوف کے قلمی جہاد کا نمایاں حصہ رہا۔ اس کے بعد ناول 'ساگھڑ' کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرتے ہوئے صاحب مضمون نے لکھا ہے کہ:

"His writings sought to arouse the spirit of protest against the usurpation of the rights of the people of Sindh."

کریم بخش خالد نے ڈیپلائی صاحب کی نگارشات میں ایک ایسا پہلو بھی تلاش کیا ہے جس کا ذکر اُن اہلِ قلم کی تحریروں میں ذرا کم ہوا ہے جنہوں نے مضامین اور تبصرے رقم کیے ہیں۔

"Yet another of his mission was to work for the emancipation of women in Sindh, whom the feudal dominated society had deprived of their basic human rights."

مضمون کے آخری حصے میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے یہ تحریر کیا گیا ہے کہ:۔

"Such men of courage and conviction are born rarely, and no homage is too great to keep their memory alive."

(ج) 'نورِ توحید'

ڈیپلائی صاحب اسلام اور اسلامی علوم کا گہرا شعور وادراک رکھتے تھے جیسا کہ ان کی بیشتر تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے۔ خصوصاً رسولِ مقبول ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور اسوۂ حسنہ پر ان کی

نگارشات فکر انگیز و بصیرت آموز ہیں۔

'نورِ توحید' جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اسلامی تعلیمات ہی سے تعلق رکھنے والی تصنیف ہے۔ بس تخصیص یہ ہے کہ اسے موصوف نے ناول کا رنگ و آہنگ دیا اور اس میں سیرتِ طیبہ کے پہلو نمایاں ہیں، جن کا جائزہ سندھی زبان و ادب کے استاد سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ سندھی کے سابق سربراہ اور مشہور و معروف افسانہ نگار ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو نے تفصیلی طور پر لیا ہے۔ بقول ان کے:

''ڈیپلائی ایک نظریاتی ادیب تھے اور شروع سے اپنے نظریات کے سچے پابند۔ وہ ایک مردِ مجاہد تھے جن کا قلمی جہاد آخری لمحوں تک جاری رہا۔ تقسیم سے پہلے وہ اسلام پسند قلمکار تھے اور تقسیم کے بعد والی حالتوں نے ان کو قوم پرست ترقی پسند صاحبِ قلم بنا دیا۔ ان کی کتاب نورِ توحید کے مختلف حصے تھے جو متعدد ناموں سے ۱۹۳۰ تا ۱۹۴۸ء اشاعت پذیر ہوتے رہے اور ۲۰۰۱ء میں اس کتاب کو حضورﷺ کی سیرت اور اسلام کے عروج پر ایک ناول کی شکل میں شائع کیا گیا۔

اس ناول کی ابتداء ایک بچی کو زندہ دفن کرنے کے واقعہ سے ہوتی ہے اور اختتام حضورﷺ اور اللہ تعالیٰ کے احکام ماننے پر، خلقِ خدا کو نیکیوں کی تلقین کرنے اور خالق و مالک کی رضا کو کامیابیوں کا ذریعہ تسلیم کرنے پر ہوتا ہے۔''

ڈیپلائی صاحب نے بڑے محتاط انداز میں سیرتِ طیبہ سے اُن محاسن کو اخذ کیا جن کی بدولت اسلام کا بول بالا ہوا اور خیرِ کثیر کا اُجالا پھیلا۔ اس پہلو کو تجزیہ نگار نے بھی اپنی تحریر میں نمایاں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نورِ توحید وقفے وقفے سے لکھا گیا (آٹھ حصوں میں) لیکن واقعات کا تسلسل قائم رکھنے میں مصنف نے کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ ایک کامیاب ناول ہے اور سندھی ناول کی تاریخ میں اہم مقام اس کو حاصل ہے۔ سندھی میں ناول کم ہیں اور ڈیپلائی صاحب کا یہ ناول ٹیکنیک اور زبان و بیاں کے اعتبار سے بھی دلکش ہے۔''

'نورِ توحید' پر یوں تو کافی تبصرے ہوتے رہے تاہم ان تبصروں کی نوعیت کچھ یوں رہی کہ جن

اہلِ قلم نے ڈیپلائی صاحب کے تصنیفی کارناموں کے حوالے سے مضامین و مقالات لکھے ان میں منجملہ دیگر تصانیف کے اس ناول کا حوالہ بھی آیا اور اس کے بارے میں رائے زنی بھی کی گئی جس کی جھلکیاں تنقید نگاروں کی مجموعی آراء میں آپ دیکھیں گے تاہم ایک اور تجزیاتی تبصرہ جناب محمد انس راجپر کا تحریر کردہ نظر سے گزرا، یہ تبصرہ موقر سندھی ادبی مجلہ 'مہران' میں چھپا تھا جس میں تبصرہ نگار نے 'نورِ توحید' کو ایک منفرد شاہکار ناول قرار دیا ہے۔

راجپر صاحب لکھتے ہیں:۔

''اس ناول میں اسلام اور اسلام کے بانی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ولادت باسعادت سے لے کر فتح مکہ تک کے تمام تاریخی واقعات کو نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس مبارک موضوع کو ناول کے روپ میں پیش کر دینا ڈیپلائی صاحب کا کمال ہے جن کو ایک باصلاحیت صاحب قلم اور ناول نگار کی حیثیت میں سندھی ادب سے دلچسپی رکھنے والے امتیازی درجہ دیتے ہیں۔ ڈیپلائی صاحب نے اولیں حصے میں دو اہم نکات کو خاص اہمیت کا حامل قرار دیتے ہوئے کارناموں کے طور پر بیان کیا ہے۔ ایک کارنامہ ان رسموں کا خاتمہ جن کے تحت عرب میں خواتین پر بڑے ظلم ہوتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ دوسرا کارنامہ یہ کہ شرک اور توہم پرستی کی جو وبائے عام تھی اس کو ختم کیا گیا۔''

مبصر نے مذکورہ کارناموں کے علاوہ ان تمام برکتوں اور رحمتوں کا ذکر بھی کیا ہے جو طلوعِ اسلام سے منسوب ہیں۔ بقول ان کے، کمال یہ ہے کہ تمام ترنیکیوں کا درس ناول کے کرداروں اور مکالموں کی موزونیت اور زبان و بیاں کی دلکشی سے عبارت ہے۔ اس لیے قاری عام فہم الفاظ میں ان حقائق سے باخبر ہو جاتا ہے جو بظاہر تو ناول کے بیانیے کا حصہ ہیں مگر ان کی مقصدی افادیت توحید و رسالت کی دائمی قدر و منزلت ہے۔

ناول کے حوالے سے ڈیپلائی صاحب کی قلمی ہنرمندی کو سراہتے ہوئے تبصرہ نگار نے لکھا ہے:۔

''میں ان کے قلم کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ کتنے اثر انگیز الفاظ میں ایک کم سن بچی کی

معصومیت کا منظر پیش کرتے ہیں۔ بچی کا وحشی باپ درندگی کا مظاہرہ کرتا ہے اور جس وقت وہ اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارتا ہے تو مظلوم بچی فریاد کرتی ہے'ابا، ابا!! یہ کیا کر رہے ہو؟'

اس دردناک منظرنامے کی الم انگیزی واقعی ایسی ہے کہ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور بقول مبصر ''لائق مصنف قاری کے دل کو ایک ایسی تڑپ دیتا ہے کہ وہ خود بھی اصلاح حال کی کسک محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ جب اس کے سامنے دونوں جہانوں کے سردار کی رونق افروزی کا قصہ شروع ہوتا ہے تو ناول کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ پڑھنے والا بڑی دلچسپی سے حضور صلعم کی حیاتِ مبارکہ کے ہر پہلو کا اپنے دل کی آنکھیں بھی کھول کر مطالعہ کرتا ہے اور مطالعہ کرتے ہوئے اسے خیال آتا ہے کہ دیکھیں اب کیسے غمزدہ ماں کو اس کی بچھڑی ہوئی بیٹی ملتی ہے؟ کب معصوم بیٹی پر جان لیوا ستم ڈھانے والے اپنے انجام کو پہنچتے ہیں؟''

ڈیپلائی صاحب کو سندھی زبان پر جو عبور حاصل تھا اس کی تعریف کرتے ہوئے راجپر صاحب فرماتے ہیں:

''ان کی زبان بہت دلکش اور قاری کے دل پر اثر چھوڑنے والی ہے۔ وہ بڑا کمال وہاں کرتے ہیں جہاں ناول میں آنے والی قرآن شریف کی آیتوں کا سادہ و سلیس زبان میں ترجمہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ ان کے تراجم پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف عربی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے بلکہ قدیم سندھی بولی اور عربی کی لسانی خوبیوں سے نیا اسلوب یہاں کس طرح پیدا کیا جائے یہ فن بھی ان کی دسترس میں تھا اور عبارت کو بہترین اسلوب تحریر دے کر دلکش انداز میں پیش کرنے پر مہارت حاصل تھی۔''

قرآن شریف کا سندھی ترجمہ

سندھی زبان میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیر کی روایت خاصی قدیم ہے اور تا حال کتنے ہی تراجم ہوئے ہیں۔ ڈیپلائی صاحب کا یہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے عام فہم، سادہ اور سلیس زبان میں ترجمے کا حق ادا کیا۔

جناب ریاض آگرو نے اسی ترجمے کے بارے میں ایک معلوماتی مضمون تحریر کیا جو 'مہر ان'
میں چھپا جس کی کچھ جھلکیاں پیش کر رہا ہوں۔

''قرآن شریف کے سندھی زبان میں کتنے ہی تراجم ہوئے ہیں جن میں مرحوم محمد عثمان ڈیپلائی
کا ترجمہ بھی بہت مشہور ہے۔ ڈیپلائی صاحب نے سندھ میں قرآن مجید کا پیغام عام کرنے کے
لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، حضرت شاہ عبدالقادر، مولانا محمود الحسن، مولانا تاج محمود امروٹی
اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور اُردو تراجموں کی مدد سے سندھی زبان میں ایک عمدہ اور سلیس ترجمہ
کیا اور اس کی اشاعت فرمائی۔ حال ہی میں ان کے فرزند محمد علی ڈیپلائی کی کوششوں سے یہ تاریخی
ترجمہ کراچی کی 'سندھیکا اکیڈمی' نے کمپیوٹر پر شائع کیا ہے جو نہایت دیدہ زیب ہے۔''

مضمون نگار نے نمونے کے طور پر آیاتِ ربانی کے کچھ تراجم پیش کرنے کے بعد لکھا ہے:

''قرآن کریم کا ترجمہ آسان بات نہیں ہے۔''

بیشک یہ آسان کام نہیں تاہم اہل علم و دانش اور عربی دان حضرات دنیا کی مختلف زبانوں میں
قرآن حکیم کا ترجمہ پیش کر چکے ہیں جن میں ڈیپلائی صاحب بھی شامل ہیں۔ ریاض آگرو نے
اعتراف کیا ہے کہ:

''مرحوم محمد عثمان ڈیپلائی کا نام ان نیک مردوں میں سرفہرست ہے۔ انہوں نے نصف صدی
پہلے قرآنی تعلیم کو عام کرنے کے لیے حیدرآباد میں 'قرآن پریس' قائم کیا جس کے ذریعے قرآن
شریف کا سلیس سندھی ترجمہ شائع ہوا۔

اس ترجمے کی حالیہ دلکش اشاعت پر تبصرہ نگار نے لکھا ہے:

''ڈیپلائی صاحب کے فرزند محمد علی ڈیپلائی تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے اپنے
لد صاحب کے اس زریں کارنامے کو زندہ رکھنے کے لیے ترجمے کا نیا اور خوبصورت نسخہ شائع
رنے میں 'سندھیکا اکیڈمی' کے اشتراک سے کامیابی حاصل کی ہے''

ناقدین کی آراء

ڈیپلائی صاحب کے ادبی وصحافتی کارناموں پر صرف سندھی زبان وادب کے ممتاز ناقدین ہی کی قابلِ قدر آراء موجود نہیں، انگریزی اور اُردو کے اہلِ نقد ونظر کے تبصرے اور جائزے بھی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ایک نابغۂ روزگار اور کثیرالجہات صاحب قلم تھے۔

موصوف کے فکروفن اور شخصیت کے تہذیبی وثقافتی، علمی وادبی اور سیاسی ومعاشرتی پہلوؤں پر سندھی زبان میں جو تنقیدی تحریریں منظر عام پر آ چکی ہیں ان کے جلیل القدر صاحبان قلم کے حوالے سے اجمالی طور پر درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

جی.ایم.سید

سائیں جی۔ایم۔سید کی شخصیت ایک سیاسی قائد، سماجی مصلح، دانشور اور ممتاز ادیب کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔ان کے خیال میں:

''ڈیپلائی صاحب طبیعت کے پُرخلوص جذباتی انسان ہیں اس لیے شروع ہی سے عمل اور ردِ عمل کے چکروں میں پھنسے رہے۔ایک حد تک میری حالت بھی یہی رہی ہے۔اُنہوں نے تبلیغی جوش سے کتنے ہی مضامین لکھے۔ان کا پہلا ردِ عمل مولوی حاجی عبدالرحیم پیچی اور مولوی حاجی احمد ملاح کے زیرِ اثر پیر پرستی کے خلاف پیدا ہوا۔وہ جب قلم اُٹھاتے ہیں تو جوش وجنوں کی بدولت معیاری زبان کو خیرباد کہہ کر طنز اور نکتہ چینی کو ممکنہ حد تک پہنچا دیتے ہیں۔حقیقت میں وہ لکھنے کی مشین تھے۔خیال آیا تو ایک ناول لکھ ڈالا۔لکھنے میں جو مشق تھی ویسا ہی پڑھنے میں شوق اور جلدی سے کتاب ختم کرنے پر عبور۔۱۹۴۲ء میں میرپور خاص کو چھوڑ کر حیدرآباد آ گئے

اور ۱۹۴۸ء میں اپنا پریس قائم کر لیا۔ اس عرصے میں مولانا مودودی کی جماعت اسلامی کا اثر ہو گیا اور اس تحریک کو آگے بڑھانے میں بھرپور کردار ادا کیا مگر یہ اثر زیادہ وقت نہ رہا۔ ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے اور زور و شور سے سرمایہ داروں، زمینداروں اور حاکموں کی کھینچا تانی کرتے رہے پھر 'انسانیت' کے نام پر نئی کتابیں اور مضامین لکھنا شروع کیے۔ رسالہ 'انسان' جاری کیا، کئی کتابیں لکھیں اور ترجمے بھی کیے۔

ون یونٹ قائم ہونے کے بعد حب الوطنی کے رنگ میں تحریر کا ایک نیا آہنگ اُبھرا مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں'' سندھ کے باشندوں پر اس وقت ایسا ظلم روا رکھا گیا ہے جیسا جاپانیوں نے چینیوں پر کیا تھا اور فلسطین کے عربوں پر یہودیوں نے نیز فرانسیسیوں نے الجیریا پر ڈھایا۔''

یہ عجیب معجون مرکب ہے۔ ایک طرف اسلامیہ دارالاشاعت کے ذریعے مذہبی کتابیں شائع ہو رہی ہیں، دوسری طرف 'ادارۂ انسانیت' سے ترقی پسند ادب اور حب الوطنی پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔ حُر تحریک کو پُراسرار قومی تحریک ثابت کرنے کے لیے کتابوں کی اشاعت ہو رہی ہے۔ ان کا لکھا ہوا بڑا ناول 'سانگھڑ' لائق مطالعہ ہے۔

ڈیپلائی کی پوری زندگی ایک جذباتی اور مخلص انسان کے عمل اور ردِ عمل کے مختلف مرحلوں میں گزری ہے۔ باوجود سخت محنت اور مزدوری کے مالی حالت درست نہ رہی اس کا خاص سبب یہ ہے کہ وہ جذبات کے آگے اور پیٹ پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ ان کا ہوش کبھی بھی جوش پر غلبہ حاصل نہ کر سکا''۔

ڈاکٹر این اے بلوچ

سندھی، اُردو اور انگریزی زبان و ادب کے ممتاز صاحب قلم، ماہر تعلیم، مثالی محقق، نقاد اور استاد الاساتذہ جناب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے نزدیک ڈیپلائی قلندر صفت مصلح، ادیب اور صحافی تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ڈیپلائی صاحب صحافی، ایڈیٹر، ادیب، پبلشر، مصنف، افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس تھے۔ وہ اسلامی تاریخ سے باخبر اور صحیح اسلامی جذبہ رکھنے والے وطن کی محبت سے سرشار اور وطن کی آزادی

کے علمبردار تھے۔ سندھی مسلم معاشرے کے غلط رویوں اور غلط رخوں کی اصلاح کے لیے انہوں نے جو تنقیدی کتابیں لکھیں ان سے عام تعلیم یافتہ طبقے میں اصلاح کا احساس پیدا ہوا۔ وہ مشکلات کا سامنا کرنے والے مہم جو انسان تھے۔ وہ سندھ کی اُن قلندرانہ صفات رکھنے والی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جو نتائج سے بے نیاز ہو کر دکھ درد اور فقر و فاقہ کی آزمائشوں سے گزرتے ہوئے توکل پسندی سے سندھ کے عوام کی خدمت کرنے میں مگن رہے۔ نا اُمیدی کا نام کبھی ان کی زبان پر نہ آیا۔ وہ کسی بھی ناکامی سے کبھی مایوس نہ ہوئے۔''

شیخ ایاز

سندھی کے صاحب طرز ادیب و شاعر شیخ ایازؔ نے ڈیپلائی صاحب کی شخصیت اور کارناموں پر ایک خیال افروز و ادب آموز مضمون ''محمد عثمان ڈیپلائی۔ میرے محسن'' کے عنوان سے تحریر کیا تھا جو مطبوعہ صورت میں میرے سامنے ہے۔ اس مضمون کا ابتدائیہ کچھ یوں ہے:۔

''نہیں معلوم کہ ڈیپلائی کا نام سن کر مجھے چو۔ این۔ لائی کا نام کیوں یاد آتا ہے۔ شاید اس لیے کہ دونوں ناموں کا آخری نصف حصہ یکساں ہے یا اس لیے کہ ڈیپلائی کے طنز و مزاح میں چینی طنز و مزاح کی خوشبو ہے جو تیسری تا چھٹی صدی قبل مسیح تک قدیم ہے اور جس کا اظہار کہانیوں اور تمثیلوں کے ذریعے ہوا ہے۔''

ڈیپلائی سے ایاز کی پہلی ملاقات ستر کے عشرے میں ہوئی جب سندھی روزنامہ 'مہران' کے ایڈیٹر سردار علی شاہ نے اسلام اور دینی حمیت و غیرت کے نام پر ترقی پسند سندھی اہل قلم کے خلاف سخت کالم اور اداریے لکھے۔ شیخ ایاز اس حوالے سے اپنے مضمون میں بیان کرتے ہیں کہ:

''سردار علی شاہ میرے اور میرے ساتھ سندھ کے ترقی پسند ادب کے خلاف روزانہ اداریہ لکھتے تھے اور دوسروں سے کالم لکھوا کر اپنے اخبار میں شائع کرتے تھے تب حیدرآباد میں ابراہیم جویو صاحب کی معرفت میری ملاقات ڈیپلائی صاحب سے ہوئی۔ پہلی ملاقات میں ہی مجھ کو اُن میں رفاقت کا احساس ہوا اور عقیدت و محبت کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس ملاقات کے بعد حیدرآباد میں

اکثر اُن سے ادبی نشستوں میں ملاقات ہوتی رہی جن کی صدارت کے لیے مجھے بلایا جاتا تھا۔ ڈیپلائی صاحب کے مزاج میں جو سنجیدگی کا پہلو ہے وہ نہایت اہم اور قابل غور ہے۔ وہ طنز و مزاح میں اپنی مثال آپ تھے اور اُس وقت میرے کام آئے جس وقت کئی 'جناتی خان' مجھ سے نبرد آزما تھے ان کی ممکنہ کوشش رہی تھی کہ وہ میری کردار کشی اور مجھ کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں۔''

پیرعلی محمدراشدی

ممتاز صحافی اور دانشور پیر علی محمد راشدی نے ڈیپلائی صاحب کو تحریک پاکستان کا ''ایک گمنام سپاہی'' قرار دیتے ہوئے روزنامہ جنگ کراچی کی ۷ر فروری ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں جو خصوصی کالم تحریر کیا تھا کہ:

''ڈیپلائی صاحب نے پوری زندگی قوم کی خدمت میں گزار دی مگر قوم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔''

راشدی صاحب نے بجا فرمایا، میری دید و شنید بھی گواہ ہیں کہ وہ سراپا ایثار تھے۔ راشدی صاحب نے مذکورہ کالم میں ڈیپلائی صاحب کے سوانحی حالات بیان کرتے ہوئے ادب و صحافت کے میدان میں ان کی خدمات کو اچھوتے انداز میں سراہا ہے مثلاً:

''سولہ برس کی عمر میں جو آگ ان کے سینے میں بھڑکی وہ ۶۴ سال تک بھڑکتی ہی رہی۔ یہ دل کی آگ تھی اور اس آگ کے کرشموں کا اہلِ بصیرت کو بخوبی اندازہ رہا ہے۔ جہاں جہاں یہ آگ بھڑکی لوہے کو سونا بنا دیا۔ ان کی بھڑکائی ہوئی آتشِ عشق وہی تھی جس کے عاشقوں کے قدموں کے نشان آج بھی نجد کے صحرا سے لے کر جامع مسجد دہلی کے زینے کے سامنے تک موجود ہیں۔ جہاں سرمدؔ سویا ہوا ہے اور اہلِ دل کے لیے وہ نقوش عاشق سجدہ گاہ بنے ہوئے ہیں۔''

راشدی صاحب نے تحریک پاکستان میں ڈیپلائی صاحب کی بھرپور شمولیت اور قائداعظم کے لشکر میں نمایاں طور پر داخل ہونے کا ذکر بھی مخصوص انداز میں کیا ہے۔ بقول راشدی صاحب:

''سندھ کے مسلمانوں کا بیدار ہونا، قائداعظم کے لشکر میں داخل ہونا، پاکستان کا سپاہی بننا،

مسجد منزل گاہ کا معرکہ سر کرنا اور سود خور ہندو اور سامراجی انگریز کو کم از کم سندھ سے خارج کرنا ،میرے علم میں قرین قیاس نہ تھا، اس قدر ہمہ گیر انقلاب کے لیے انسانی ذہن تیار کرنا تھا اور یہ فریضہ اس سپاہی نے سرانجام دیا!''

محمد ابراهیم جویو

محمد ابراہیم جویو سندھی زبان و ادب کی ایک کہنہ مشق شخصیت ہیں۔ سہ ماہی 'مہران' کے اوّلیں مدیر رہے۔ محکمہ تعلیم کے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ سندھی ادبی بورڈ کی ترقی و توسیع میں نمایاں کردار انجام دیا۔ تنقیدی مضامین بھی خوب لکھے ہیں۔ وہ ڈیپلائی صاحب کو اپنا بزرگ ساتھی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محترم محمد عثمان ڈیپلائی کو جب میں نے جانا پہچانا تو اندازہ ہوا کہ وہ دوسروں کے لیے جینے کی ایسی اُمنگ اور مستقبل کی بہتری کے لیے ایسا جذبہ رکھتے ہیں جسے میں مثالی تصور کرتا ہوں۔ حقیقت میں وہ میرے لیے بھی اسی بنیادی انسانی عظمت کی روشن مثال ہیں۔

جویو صاحب کے مضمون میں ڈیپلائی صاحب کی شخصیت اور کثیر الجہات تصانیف پر سیر حاصل تبصرے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ جویو صاحب رقم طراز ہیں:

''میں نے ڈیپلائی صاحب کے ادب اور ذاتی کردار کا مطالعہ کیا ہے اور ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ زندگی کے محاذ پر ان کے سامنے بدی کے چار زندہ نشان یا کردار رہے ہیں ہمیں ان کے ناموں کا علم ہونا چاہیے وہ ہیں پیر، ملا، زمیندار، ساہوکار اور کامورو یعنی نوکر شاہی کا کارندہ۔ یہ چاروں کردار ان کے نزدیک 'وِلَن' کے کردار ہیں جن کی حرکتوں کو سمجھے بغیر ہم ڈیپلائی صاحب کے سورمائی کرداروں کو سمجھ نہیں سکتے۔ ان کی ترتیب سے اختلاف کی گنجائش تو ہو سکتی ہے تاہم سندھ میں سندھی سماج کے سارے بگاڑ اور ناکامی کا سبب یہی چار کردار رہے ہیں۔

ڈیپلائی صاحب کے قلم اور زبان و بیاں کی ساری قوت اُنھیں کی کرتوتوں کو اُجاگر کرنے پر صرف کئے۔ ان کے افسانے، ڈرامے، علمی کتابیں اور مضامین جن کی تفصیل و شمار کا یہ موقعہ نہیں

اور اگر کوئی بتائے تو اچھا ہے۔ بہر کیف یہی چار سندھ کے مظلوم ومحکوم سماج کے لیے پوری قوت اور پورے اقتدار کے مالک ہیں اور کیونکہ بذات خود یہ بھی دوسروں کے غلام اور محتاج ہیں اس لیے ایک طرف بزدل، بے عزت اور بیچارے ہیں یعنی اپنے آقاؤں کے آگے جھکنے اور بہر طور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے ممکنہ جتن کرتے ہیں۔ دوسری جانب ان کا اپنا مزاج یہ ہے کہ کٹھور، بے حس اور طاقتور ہیں''۔

غلام ربانی آگرو

سندھی کے ممتاز افسانہ نگار غلام ربانی آگرو کا نام صرف ایک قلمکار کے طور پر نہیں بلکہ سندھی ادبی بورڈ کے سیکریٹری، سندھ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر اور اکادمی ادبیات پاکستان کے سابق صدر نشین کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت رکھتا ہے۔ وہ ڈیپلائی صاحب کو سندھی مشاہیر میں ایک اہم نام کے طور پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' ڈیپلائی صاحب نے جب اسلامی رنگ میں ناول لکھے تو ہندو اہل قلم کی طرف سے کوئی خاص مزاحمت پیش نہ آئی اور ہندو قارئین کے ہاتھوں بھی کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ البتہ ایک آدھ کتاب پر سرکاری بندش ہوئی۔ دوسری جانب ان کی کتابیں عام مسلمانوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ سندھ میں پیری مریدی کا بہت زور تھا جواب بھی ہے۔ ڈیپلائی صاحب نے پیر پرستی کے خلاف لکھا اور دل کھول کر لکھا۔ پیروں اور ان کے مریدوں نے بھی ان کو کوئی نقصان نہ پہنچایا لیکن جب 'انسان' رسالہ نکالا تو جیل میں ڈالے گئے اور مالی تنگدستی کا عذاب الگ برداشت کیا۔

جمال ابڑو

جمال ابڑو ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے زیر اثر سندھی افسانہ نگاری کو اوّلیں دور میں سماجی حقیقتوں کی عکاسی کے لیے عروج پر پہنچانے والے افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔ جمال ابڑو کو ان میں امتیازی حیثیت حاصل تھی جنہوں نے 'پیرانی' جیسے شاہکار افسانے تخلیق کیے۔

ڈیپلائی صاحب کو سندھی افسانوی ادب میں پیشرو کی حیثیت حاصل رہی جس کا اعتراف جمال ابڑو نے بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

''ڈیپلائی صاحب عجیب بھل مانسی کا پیکر تھے۔ بہت مذہبی اور پکا مسلمان ہوتے ہوئے بھی ان کے دل میں غریب عوام کے لیے بھرپور ہمدردی تھی۔ وہ ہاریوں اور محنت کشوں کا بھلا چاہتے تھے۔ بڑی نیک نیتی اور پورے اخلاص سے عوامی تحریکوں کے حامی بن جاتے۔ اس سلسلے میں ان کو طعنے بھی ملتے پر یہ مرد مجاہد بے پرواہی اور لاغرضی سے اپنی روش پر قائم رہتا۔ سرکاری عتاب اور مالی نقصان کی پرواہ بھی نہ کی۔''

رشید بھٹی

رشید بھٹی سندھی کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا ایک مشہور و معروف نام ہے جو سکھر میں ہماری ادبی کانفرنسوں اور سندھ کی ادبی تنظیموں میں سرگرم عمل رہا خصوصاً سندھی ادبی سنگت کو ترقی پسند اہل قلم کی نمائندہ تنظیم بنانے میں پیش پیش رہے۔ ڈیپلائی صاحب سے جو تعلق خاطر تھا اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

''ڈیپلائی ان بزرگوں جوگیوں میں تھے جو ہمیشہ جوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور رہنمائی بھی فرماتے 'نور توحید'، 'ڈاہری رنگ محل'، 'مرشد کی ڈاڑھی'، 'سانگھڑ'، 'جاپانی گڑیا'، 'گورکی کی ماں' اور آخر میں 'ایرانی انقلاب'۔ ڈیپلائی کی سوچ اور فکر میں ارتقا و تغیر کے نمایاں مظہر ہیں۔ ہم اور ہمارے معاصرین اور پھر ہمارے بعد آنے والی نسل کے ادیب بھی ذہنی ارتقاء کی انھیں منزلوں سے گزرتے ہوئے آج کے رستے تک پہنچے ہیں۔

میں یہ اعتراف کرنے میں بھی حق بجانب ہوں کہ مجھ کو اور میرے ہم عمر ادیبوں کو جن بزرگ ادیبوں، دانشوروں اور ادبی رہنماؤں نے متاثر کیا اور فکر و خیال کو جلا بخشی ان میں ڈیپلائی مرحوم ایک اہم شخصیت تھے۔''

(روزنامہ 'هلال پاکستان'. ۱۶جنوری ۱۹۸۳ء)

کریم بخش خالد

کریم بخش خالد ایک تنقیدی و تحقیقی مضمون میں ڈیپلائی صاحب کو مزاحمتی ادب کا پیشرو اور بے باک صحافی قرار دیتے ہوئے اپنے مؤقف کی وضاحت جن الفاظ میں کرتے ہیں ان کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

''ڈیپلائی صاحب نے اپنے پیشرو اکابرین سندھ کے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے صحیح معنوں میں ذہنی انقلاب برپا کیا۔ ان کی تحریروں میں اپنے دل کی دھڑکنیں، ذہن کی سچائی، ایمان کی پختگی اور مفید نتائج کا یقین تھا، اس لیے وہ نصف صدی تک ادبی اُفق پر روشن رہے بلکہ ان کی نگارشات میں خلوص و محبت کی جو روشنی تھی اس نے بہت سے مردوں، عورتوں اور نوجوانوں میں ایک نیا حوصلہ پیدا کیا۔ آزادی کے لیے تڑپ پیدا کی اور سماجی سدھار کو سنوارنے کے لیے تاعمر کوشاں رہے۔

وہ پُر بہار شخصیت کے مالک تھے۔ یاس و نا اُمیدی کے سایے کو بھی کبھی اپنے سامنے نہ آنے دیا۔ نیکی اور بدی کی لگاتار کشمکش میں انہوں نے قلم سے بڑا کام لیا۔ ان کی ۱۳۰ تحریکی کتابیں اور سینکڑوں مضامین جو منظر عام پر آئے ہیں وہ اُن کی عملی زندگی کے مختلف ادوار کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالتوں کا عکس پیش کرتے ہیں اور اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہیں کہ ڈیپلائی صاحب کی سدابہار افتادِ طبع نے پُر لطف اور سبق آموز نگارشات سے ویسی ہی رہنمائی کی ہے جیسی شیخ سعدی نے اپنی فارسی تصانیف اور عالمی دانشوروں نے اپنے ملفوظات سے فرمائی ہے۔ وہ زود نویس، تیز قدم، حاضر جواب، وسیع المطالعہ قلمکار تھے۔ قلم سے انہوں نے جھوٹ، منافقت، بے ایمانی اور بداعمالی کے خلاف ہمت، جرأت، بے خوفی اور بے تکلفی سے دلچسپ حکایتوں، پُرلطف لطیفوں اور سبق آموز اقوال کے ذریعے اصلاح حال کا کام لیا ہے۔ ایسا گُن بہت ہی کم انسانوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اس حوالے سے وہ بڑے سالک اور خدا دوست انسان تھے جنہوں نے احتجاج اور مزاحمت کا صوفیانہ طریقہ اختیار کیا۔''

محترم کریم بخش خالد کا بھرپور مقالہ جو مرحوم نے ڈیپلائی صاحب کی یاد میں منعقد کیے جانے والے سیمینار میں پیش کیا تھا۔ روزنامہ 'ہلال پاکستان' میں ۷رفروری ۱۹۹۸ء کو شائع ہوا۔ اس مقالہ خصوصی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ممدوح کے تصنیفی کارناموں اور شخصی محاسن کا جائزہ بڑی عمدگی سے تاریخی تناظر میں لیا گیا اس لیے کچھ اور جھلکیاں بھی پیش کرنا ضروری ہے مثلاً یہ اقتباس کہ:

''اب وہ دردمند دانشور صاحب قلم ہمارے درمیان نہیں جو قلم کی آبرو کی علامت تھا جس نے قلم سے شمشیر آبدار کا کام بھی لیا۔ جس کے اقوال جہالت کے خلاف ہم لوگوں جیسے ہوتے تھے۔ جس کی ذاتی زندگی سادگی، وفا شعاری اور خلوص و دیانت سے عبارت تھی۔ جس نے اپنے ذاتی مفاد پر عوامی بہبود اور عوامی بھلائی کو ترجیح دی۔ وہ خود کو مستقبل کا معمار تصور کرتے ہوئے سوچتے تھے۔ خلقِ خدا کی فلاح و بہبود کو اپنے اہل و عیال جیسا سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک خلقِ خدا کی ہدایت، کفالت اور معاونت کے لیے سعی کرنا اعلیٰ عبادت تھی۔''

کریم بخش خالد صاحب نے اہلِ سندھ سے ان کی والہانہ محبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ڈیپلائی نے سندھیوں کو، دوسروں کے لیے جینے کا سبق دیا اور مثالی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے رہے کیونکہ اپنے تہذیبی ورثہ کی اعلیٰ روایات کے مطابق تاریخی کردار ادا کرنے کی اہمیت کو وہ اچھی طرح جانتے تھے۔''

مضمون کا اختتام صاحب مضمون نے جس خراجِ عقیدت و محبت پر کیا ہے اس کا اندازہ درج ذیل عبارت سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

''ڈیپلائی بڑے مؤحد تھے زندگی کے اُتار چڑھاؤ ان کے اعتقاد کو متزلزل نہ کر سکے۔ وہ خود اعتمادی سے خدا دوستی، وطن دوستی اور انسان دوستی کے آدرش دعوت عام کی صورت اپنے قارئین تک پہنچاتے رہے اور اس سلسلے میں اپنے عیش و آرام، عزّ و جاہ اور عصری حیثیت سازی سے قطعی بے نیاز ہو کر سندھ باسیوں کی کردار سازی کے لیے دل و جان کی بازی لگائی۔ انہوں نے اپنے فکر و عمل سے ثابت کیا کہ وہ سندھی مزاحمتی ادب کے بجا طور پر پیشرو تھے۔''

شمشیر الحیدری

شمشیر الحیدری کا شمار سندھی کے ممتاز شعرائے کرام اور سندھی ادبی شخصیت کے بزرگ قائدین میں ہوتا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے لیے بہت کچھ لکھا۔ تنقیدی اور تحقیقی میدان میں جولانیاں دکھائیں۔ ڈیپلائی صاحب کی شخصیت اور فن پر ان کا طویل مقالہ سندھی ادبی بورڈ کے جریدے سہ ماہی 'مہران' شمارہ ۳-۴ سوانح نمبری ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ زیادہ تر وہی باتیں ہیں جو پچھلے اقتباس و آراء میں بیان کی جا چکی ہیں اس لیے ان کو دہرانا بے سود ہے البتہ بذلہ سنجی، فقرہ بازی اور ٹوٹکوں کے حوالے سے جو خیال شمشیر الحیدری نے ظاہر کیا ہے وہ ڈیپلائی صاحب کی بیشتر تحریروں کو شگفتگی بخشنے کے مصداق رہا ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''ڈیپلائی کی شخصیت پر دو چیزیں بُری طرح حاوی ہیں بذلہ سنجی اور ٹوٹکے، اگر ڈیپلائی کے ٹوٹکے، کتابی صورت میں یکجا کیے جائیں تو اتنی جلدیں تیار ہو جائیں جتنی اسلامیہ دارالاشاعت کی جملہ کتابیں اور پھر یہ کتاب سندھی زبان میں ''لوک ادب'' کی لغت کے طور پر ہر حالت کے حوالے میں استعمال ہو سکے۔ ڈیپلائی نہ صرف ٹوٹکے باز بلکہ 'ٹوٹکہ ساز' ہیں۔ وہ ٹوٹکے کی صنف کے موجد و خالق ہیں۔ ہر بات میں اور ہر قسم کے واقعہ پر فوراً اور فی البدیہہ ٹوٹکے کا استعمال کمال کی خصوصیت ہے۔ ٹوٹکے ڈیپلائی کی مکمل زندگی ہیں اگر صرف ان کے ٹوٹکے کسی طرح قلمبند ہو سکتے تو کم از کم ان کی آدھی زندگی تو محفوظ ہو جاتی۔''

واقعی ان کے بذلہ سنج فقرے اور گہری کاٹ رکھنے والے لطائف لاجواب ہوتے تھے۔ بقول شمشیر الحیدری:

''وہ کبھی بھی اپنی ذاتی بزرگی کو نوعمر دوستوں پر مسلط نہیں کرتے اور تکلف و برتری کا سبب نہ بنتے۔ وہ نوجوانوں کے بہترین دوست، زندہ دل، مہربان، ہمدرد رفیق اور دل کے ایسے تونگر کہ نہ صرف ان کے دوست اور واقف کار بلکہ ہر آدمی ان سے نیکی کی ہر اُمید رکھ سکتا تھا۔ ان کی ادبی حیثیت کے لیے اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ وہ سندھ کے موجودہ دور کے بڑے سے بڑے ناول

نگار اور ڈرامہ نویس ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے ان دونوں اصناف میں کوئی ان کا ہمسر نہیں۔''۔

شمشیر الحیدری نے نوجوانوں کی ذہنی تربیت کے حوالے سے ڈیپلائی صاحب کی توصیف میں لکھا ہے کہ:

''نوجوانوں سے نہ صرف ان کا قلبی ربط تھا بلکہ حقیقی اُنس رکھتے تھے وہ بخوبی جانتے تھے کہ آج کی تاریخ کو ترتیب دینا انہیں باصلاحیت نوجوانوں کے ذمے ہے، یہی قومی مستقبل کے نمائندے ہیں۔''

ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو

پروفیسر ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو صاحبہ پاکستان کی معروف دانشور اور تعلیمی ماہر ہیں۔ تاریخ پہ اُن کی خاص دسترس ہے۔ وہ صوبائی وزیر تعلیم کے عہدے پر بھی فائز رہ چکی ہیں ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو ڈیپلائی صاحب کو اپنا استاد اور اپنا رہبر تسلیم کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

''یہ ڈیپلائی صاحب کی کتابیں تھیں جنہوں نے مجھے سندھی سکھائی، بلکہ تاریخی شعور بھی عطا کیا، اسلامی دنیا کا نظارہ دکھایا، میں تو یہ بھی کہوں گی کہ آج جو میں تاریخ داں ہی ہوں وہ بھی ڈیپلائی صاحب کی کتابیں پڑھ کر۔ یہ ان کے تاریخی ناول تھے جن کو پڑھ کر مجھے تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔''

تحریک پاکستان میں ڈیپلائی صاحب کے کردار کی وہ معترف ہیں اور بتاتی ہیں کہ:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تحریک پاکستان ایک سطح پر سیاستدان لڑ رہے تھے، کانفرنسوں اور جلسوں کے ذریعے، لیکن یہ ڈیپلائی تھے جنہوں نے اس تحریک کو عوام میں اتنا مقبول کیا کہ ہر نوجوان، بچہ ہر خاندان اس سے متاثر ہوا۔ ڈیپلائی صاحب کی نگارشات ایک کھڑکی کے مثل تھیں جس سے وہ دنیا کو دیکھتے تھے جس کی وجہ سے اُن میں جذبہ پیدا ہوا اور سندھ میں تحریک پاکستان کے لیے اتنی بڑی تائید پیدا ہوئی۔

مظہرالحق صدیقی

سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ممتاز دانشور اور سندھی ادب کے پارکھ محترم مظہرالحق صدیقی

کے خیال میں ڈیپلائی صاحب دردمند دل والے مجاہد تھے ۔ ۱۹/مارچ ۲۰۰۰ء کو کراچی میں ڈیپلائی صاحب کی بصیرت افروز کتاب 'نورِ توحید' کی نئی اشاعت کا تعارفی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت صدیقی صاحب نے فرمائی اور صدارتی تقریر میں یہ کہا کہ:

''جس دور میں ڈیپلائی صاحب نے اپنے قلم کی تلوار کو بے نیام کیا متعصب ہندو ہمیں جاہل اور غیر متمدن سمجھتے تھے اور اپنے کلچر کو بے حد اعلیٰ جانتے تھے، ایسے وقت میں ڈیپلائی کی تحریریں بڑے جہاد کی باتیں تھیں ۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ ہمارے سندھ کی تاریخ میں کوئی اتنا بڑا مجاہد پیدا ہوا ہو جس کے قلم کی تلوار میں ایسی آبداری اور اتنا اثر پایا جائے کہ اپنی قوم کے دشمنوں سے نبرد آزما ہو کر ظالموں کے خون کی ندیاں بہادے۔''

ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو

ممتاز سندھی ادیب اور سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ سندھی کے سابق سربراہ ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو جو کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، انہوں نے ڈیپلائی صاحب کی شخصیت کے مجموعی تأثر کو اپنی ملاقاتوں کے حوالے سے ظاہر کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے کہ:

''ڈیپلائی صاحب علم وادب کی روشنی کا ایک منارہ، ہمارا یہ مردِ مجاہد صاحب قلم اپنے دور میں منفرد اور یگانہ تھا۔ بیسویں صدی کے تمام ادبی وصحافتی حاصلات میں کسی دوسرے سے تحریروں کی تعداد اور معیار کی پرکھ کے لحاظ سے کمتر نہیں ہے۔''

مراد علی مرزا

جناب مراد علی مرزا سندھی کے ممتاز ڈرامہ نگار اور ریڈیو پاکستان کے اعلیٰ عہدیدار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے ڈیپلائی صاحب کے افسانوں پر تحقیقی وتنقیدی حوالے سے تاج بلوچ کے ماہنامہ ''سوجھرو'' اپریل ۲۰۰۲ء کے شمارے میں ایک مضمون پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''ان کے افسانوں میں سنجیدگی ہے دُکھ اور غم ہے۔ سندھ کے پسماندہ و مسکین عوام صدیوں سے طرح طرح کے آزار جھیل رہے ہیں۔اُن کے مغموم دلوں کی فریاد میں ظالم حاکموں، وڈیروں اور ملاؤں کے ظلم و جبر کی داستانیں ہیں جو ڈیپلائی صاحب نے اپنی محسوسات میں جذب کیں۔ ان کا کوئی بھی افسانہ پڑھیں آپ کو اس میں ظالم اور مظلوم کے کردار ملیں گے، زور اور زبردستی کی مثالیں نظر آئیں گی اور وہ بھی عام فہم، سادہ اور سلیس زبان و بیان کی صورت میں حالانکہ واقعات اپنے وقت اور زمانے کے ہیں تاہم ان کو پڑھ کر ذہن میں کتنے ہی سوال ابھرتے ہیں اور یہ سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ ڈیپلائی صاحب اپنے سماج کے یہ افسانے اہم مقاصد کے تحت لکھتے تھے تاکہ ان کے ان کے ذریعے سندھ کے عام لوگوں میں ذہنی بیداری پیدا ہو، سندھ میں ظالمانہ سماج اپنے انجام کو پہنچے اور ظلم و جبر کا خاتمہ ہو۔ ایک ایسا سماج قائم کیا جائے جس میں امن و انصاف اور خوشحالی کا دور دورہ ہو۔''

قمر شہباز

جناب قمر شہباز کہنہ مشق شاعر و ادیب حکومت پاکستان کے بڑے مناصب پر فائز رہے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور طرزِ تحریر میں جدت و ندرت کے دلدادہ۔

ڈیپلائی صاحب ''مہاڈاھو'' (عظیم دانشور) کے عنوان پر روزنامہ ''جاگو''، کراچی مطبوعہ ۸ر فروری ۱۹۹۶ء کی اشاعت میں ان کا جو مضمون شائع ہوا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں:

''ہماری نسل کے لکھاریوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو محمد عثمان ڈیپلائی سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پچاس برسوں سے لگاتار لکھنے والا یہ شخص سندھی ادب کے ان چند لکھنے والوں میں ایک تھا جس نے اپنی ہمت، محنت اور ایمان کی پختگی کے سبب ہمیشہ کے لیے دنیائے ادب میں اپنا منفرد مقام پیدا کر لیا ہے۔''

قمر شہباز نے ڈیپلائی صاحب سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ:

''میں نے ہر وقت ان کو علم و ادب کے کاموں میں مشغول دیکھا۔ وہی معصومیت، وہی سادگی،

وہی لگن وہی تڑپ، وہی جدو جہد۔ ایک مشن تھا جس میں وہ ہمہ تن منہمک رہے۔ بیماری اور پیری بھی ان کے جوش و جذبے کو کہاں کم کرسکیں؟ انہوں نے اپنے پیچھے عزم، ولولے، ہمت اور جوش و جذبے کا جو عظیم ورثہ چھوڑا ہے۔ دُکھ یہ ہے کہ ہم نے اس کی قدر نہ جانی۔ اُن کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے نہ ان کا اشاعت گھر حیات نو پاسکا نہ ان کی تصانیف کی نئی اشاعتیں ہوئیں۔ نہ ہم ان کی نام پر کوئی ادارہ قائم کر سکے۔ ایک ایسے محسن کو ایسی ناگوار موت تو اغیار بھی نہیں دیتے پھر ہم نے ایسی بدرسم کیوں قائم کی۔''

قمر شہباز کے آخری فقروں سے اختلاف کی گنجائش موجود ہیں کیونکہ ڈیپلائی صاحب کی یادوں کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے فرزند محمد علی ڈیپلائی اور دختر ڈاکٹر ثریا سوز ڈیپلائی نے کتابوں کی اشاعت اور شخصیت کی پذیرائی کے لیے تواتر سے یادگار تقاریب کا اہتمام کیا۔ حیدرآباد میں ڈیپلائی میموریل ٹرسٹ بھی قائم ہے جو فلاحی و رفاہی ادارے کے طور پر سرگرم عمل ہے۔

شیخ عزیز

شیخ عزیز کا شمار ممتاز ادیبوں اور صحافیوں میں ہوتا ہے، آج کل وہ سندھی ادبی بورڈ کے وائس چیئرمین ہیں۔ انہوں نے ڈیپلائی صاحب کو''بسیار نویس ادیب'' قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''وہ کتنے ہی ادوار کے مشاہدہ نگار تھے اور ہر دور ایک نئے رنگ سے بھرپور ہے۔ کبھی کسی تحریک کے حق میں کالم لکھے تو کبھی ناول نگاری میں منہمک رہے۔ افسانے بھی تخلیق کئے، پھر آزادی کی جدوجہد کے لیے اپنے قلم کو وقف کردیا تو انفرادی آزادی کے لیے بھی لڑے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، ہمیشہ ذاتی غرض سے زیادہ اجتماعی مفادات کو ترجیح دی۔ ساری عمر نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ بنی رہی۔''

شیخ عزیز نے ان کی تقریری جوہر کا ذکر بھی کچھ یوں کیا ہے کہ:

''وہ نہایت ذہین اور تیز حافظہ رکھنے والے مقرر تھے۔ ادبی نشستوں اور محفلوں میں وہ کورا کاغذ ہاتھ میں لے کر ایسی کہانیاں اور مضمون پڑھتے تھے جو کبھی بھی نہ لکھے گئے۔ سندھی ادب کی

مختلف تحریکوں میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا۔ کچھ عرصے سہ ماہی ''مہران'' کے مدیر مسئول بھی رہے غرض یہ کہ آخری دم تک لکھنا نہ چھوڑا۔''

ڈاکٹر قاضی خادم

پروفیسر ڈاکٹر قاضی خادم نے اول اول افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت پائی اور افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہوا۔ سندھ یونیورسٹی کے شعبہ سندھی کے پروفیسر اور صدر نشین کے طور پر بھی نیک نام رہے ۔ ڈیپلائی صاحب کے بارے میں کچھ لکھنا ان کے خیال میں آسان کام نہیں جو گزشتہ نصف صدی سے مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ قاضی خادم نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ڈیپلائی صاحب سماج کے ایک بے ریا اور سچے نقاد ہیں۔ جب سے میں نے پڑھنا شروع کیا ان کی کتابیں میری بہترین ساتھی رہیں۔ مجھے یہ تو خبر نہ تھی کہ پیروں فقیروں کی ٹھگیاں، وڈیروں کی زبردستیاں اور دولت مندوں کی زورآزمائیاں کیا ہوتی ہیں پر یہ باتیں پسند ضرور آتی تھیں مثلاً 'ڈکار' (قحط) کے بارے میں ان کا تحریر کردہ ڈرامہ پڑھ کر افسروں کی خراب حرکتوں اور بے ایمانیوں کے خلاف جو نفرت پیدا ہوئی وہ آج تک موجود ہے۔''

جام ساقی

جام ساقی کا نام عموماً پاکستان کی ترقی پسند تحریکوں کے قائدین میں شمار ہوتا ہے۔ سندھی زبان و دب کے سلسلے میں بھی ان کی تحریریں خیال افروز ہیں۔ ڈیپلائی صاحب کے تصانیف کے بارے میں ان کا تاثر یہ ہے کہ:

''یہ جو سندھ میں پیر پرستی کی جہالت کم ہوئی ہے اور بڑی تعداد میں موحد موجود ہیں اس تبدیلی میں بڑا ہاتھ ڈیپلائی کی تحریروں کا ہے۔ انہوں نے بے شمار کتابیں اور مضمون لکھ کر اس ندھیرے کو کافی حد تک دور کیا جو سندھی سماج کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ سندھ میں سائنسی نداز فکر پیدا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سیاست کا سبق بھی ہمیں ڈیپلائی

صاحب نے پڑھایا۔ان کی کتابیں نہ ہوتیں تو ہم میں بہت سے قومی کارکن نہ بنتے۔جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ان کے کارناموں کی اہمیت زیادہ اُجاگر ہوتی جائے گی اور سرزمین سندھ ہمیشہ ان کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتی رہے گی۔

''جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بولنے میں رکاوٹ کی وجہ سے حضرت ہارون علیہ السلام کی رفاقت عطا ہوئی،اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سندھیوں جیسی گونگی مجبور مظلوم قوم کی بھی سن لی جو ڈیپلائی صاحب جیسے تیز اور سادہ اور پُر اثر طرز تحریر والی شخصیت اُنہیں عطا ہوئی۔''

ڈاکٹر حبیب اللہ صدیقی

ڈاکٹر حبیب اللہ صدیقی،ڈیپلائی صاحب کی تصنیفات کے مجموعی تاثر کو ''سندھی علم وادب کا سنہرا ورق'' تسلیم کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ:

''انعاموں اور عتابوں سے بالاتر رہ کر وہ سچ لکھتے رہے۔انہوں نے ہر برائی پر قلم سے وار کرکے اسے بے نقاب کیا پھر ایسا ہی ہوا جیسا کہ ہمارے معاشرے میں ہوتا آیا ہے کئی کتابیں ضبط کر لی گئیں کیونکہ وہ انقلابی سوچ اجاگر کر رہی تھیں۔''

پروفیسر ڈاکٹر نورافروز خواجہ

پروفیسر ڈاکٹر نورافروز خواجہ چیئر پرسن شعبہ سندھی،یونیورسٹی آف سندھ نے اپنے طویل تحقیقی مقالہ میں تحریر کیا ہے کہ:

''ڈیپلائی صاحب کا نسلِ نو سے نہ صرف قلمی رشتہ تھا بلکہ ان کو نسلِ نو کے مستقبل کی اہمیت واحترام سے بھی پوری واقفیت تھی۔وہ جانتے تھے کہ آج کی تاریخ کو ترتیب دینا انہیں نوجوانوں کے اختیار میں ہوگا اور یہی تو اس قوم کے مستقبل کی ضمانت ہیں،ترقی وخوشحالی کے نمائندے ہیں۔یہی سبب ہے کہ سائیں ڈیپلائی نے سندھ کے ہر ادبی وقومی رجحان میں نئی نسل کی نمائندگی کو ترجیح دی۔وہ نہ صرف ایک ایڈیٹر،پبلشر،ناول نگار،افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس تھے بلکہ ایک اچھے نقاد بھی تھے''۔

پروانہ بھٹی

کہنہ مشق شاعر، ادیب اور صحافی جناب پروانہ بھٹی نے ڈیپلائی صاحب کو بہت قریب سے دیکھا، سنااوران کی تحریروں کوغور سے پڑھا ہے ان کی رائے میں:

''مذہبی دور کی کتابوں کے بعد ڈیپلائی صاحب نے سماجی برائیوں کی نشاندہی فرمائی اور غیر اخلاقی حرکتوں کے خلاف لکھا۔'مرشد کا گھوڑا' اور ایسی ہی کئی دوسری کتابیں ان کے بے پناہ قلمی جہاد کا ثبوت ہیں۔ اسی عرصے کے دوران 'ون یونٹ' کے طوق کو اُتار کر اور ختم کرنے کے لیے سندھ کے ادیبوں، شاعروں اور مفکروں کی جو مشترکہ جدوجہد شروع ہوئی، ڈیپلائی صاحب نے اپنے ہفت روزہ 'انسان' کے ذریعے 'ون یونٹ' کے بُت کو پاش پاش کرنے اپنی تحریروں سے بھرپور حملے کئے۔ ادبی محفلوں میں ان کی موجودگی ضروری ہوتی تھی۔''

سلطانہ وقاصی

محترمہ سلطانہ وقاصی سندھی زبان وادب کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کے ایک مضمون میں جو ۲۰۰۱ء کی تحریر ہے یہ واضح کیا گیا ہے کہ:

'' ڈیپلائی صاحب تھر کے غریب علاقے کو خیر باد کہہ کر حیدرآباد آئے وہ دور انگریزوں کی حکمرانی کا دور تھا۔ سندھی مسلمان علم سے بے بہرہ ہوتے گئے اور معاشی طور پر کمزور ہونے کے سبب ہیجانی کیفیت کا شکار ہوئے۔ ایسی حالتیں دیکھ کر اور اپنے لوگوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے ڈیپلائی صاحب بذات خود ایک عقلمند مصلح اور نفسیاتی ماہر بن گئے۔ انہوں نے اسلام کے مختلف ادوار کو تاریخی ناولوں کا روپ دیا اور ان کو اتنا اثر آفریں بنا دیا کہ پڑھنے والوں کے دماغ روشن ہو گئے۔ انہوں نے واقعات کو کچھ ایسے اچھوتے انداز میں تحریر کیا کہ جو ہندو سندھ میں کوئی بھی صاحب قلم ویسا تحریر نہ کر سکا۔''

پروفیسر ڈاکٹر غلام علی الانہ

ڈاکٹر الانہ صاحب کا شمار ملک کے معروف ماہر تعلیم اور ماہر لسانیات میں ہوتا ہے۔ وہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور جامعہ سندھ کے وائس چانسلر، سندھی لینگویج اتھارٹی کے چیئرمین اور انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں وہ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے سندھ کو لطیف سائیں کے بعد تین بڑی شخصیات عطا کی ہیں۔ مرزا قلیچ بیگ، محمد عثمان ڈیپلائی اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ سندھ کی تاریخ، ادب اور زبان پر ان کے بڑے احسانات ہیں۔''

(نیوز اینڈ اوپینئین)

رسول بخش پلیجو

سندھ عوامی تحریک کے رہنما رسول بخش پلیجو کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ سیاست کے علاوہ وہ بطور افسانہ نگار اور تنقید نگار ایک بڑا مقام رکھتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے ڈیپلائی صاحب کی شخصیت پر تاج جویو کی مرتب کی ہوئی کتاب ''انسان دوست ادیب اور بیباک صحافی'' کو اپنی 'سندھ عوامی تحریک' کے سرگرم کارکنوں کے لیے ایک اہم مطالعاتی مواد قرار دیتے ہوئے اُنہیں ہدایت دی کہ:

''ڈیپلائی صاحب کے بارے میں لکھی ہوئی یہ کتاب آپ لوگ ضرور پڑھیں۔ سندھی خواندہ لوگوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ لازم ہے۔ جن لوگوں کا ادب اور سیاست سے تعلق ہے اُن کو بھی یہ کتاب لازماً پڑھنی چاہیے۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد ہر باضمیر سندھی کو پشیمانی اور شرمندگی ہوگی کہ تھر جیسے ریگستانی اور پس ماندہ علاقہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ڈیپلو سے جنم لینے والے، بنیادی طور پر سندھی کی صرف چھ جماعتیں پڑھے، غریب طبقے کا ایک شخص ہمالیہ پہاڑ جتنے بڑے کام، کسمپرسی کی حالت میں کرسکتا ہے، تو پھر میں کیا کر رہا ہوں؟، اس سے پہلے کیا کرتا رہا ہوں؟''

حال ہی میں ڈیپلائی صاحب کی لکھی ہوئی دس کلاسیکی کتابوں کے تقریب رونمائی میں وہ کہتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ اس شخص نے تنہا ایک دور مرتب کیا۔انہوں نے ہمیں اسلام کے بارے میں ایک جدید رویہ دیا جو انتہائی معقول اور عملی تھا اور اب تک کارگر ہے۔ان کا شمار ہمارے بڑے سے بڑے انقلابیوں میں ہونا چاہیے......ان کا ذکر گھر گھر میں ہونا چاہیے...... ایسے آدمی عام آدمی نہیں ہوتے بلکہ ایک کرامت ہوتے ہیں۔ان پر ریسرچ ہونی چاہیے۔''

مددعلی سندھی

معروف ادیب وشاعر اور سندھی روزنامہ ''سندھ نیوز'' کے ایڈیٹر مدد علی سندھی کے مطابق:

''ڈیپلائی اپنے وقت کے فردوسی تھے۔ ہر فردوسی کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے بظاہر وہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے چلے گئے مگر عثمان ڈیپلائی جیسا مجلسی اور رونقی انسان قبر کے اندر بھلا کیسے رہ سکتا ہے وہ ہمارے خوابوں اور یادوں میں واپس آجاتے ہیں۔ ڈیپلائی ان چند انسانوں میں ایک ہیں جن کے جسم زمین میں دفن ہو جاتے ہیں مگر ان کی زندگی ہمیشہ کے لیے زمین پر رہ جاتی ہے۔''

پروفیسر ڈاکٹر اللہ رکھیو بٹ

علم کتابیات (Bibliography) میں ڈاکٹریٹ کا اعزاز رکھنے والے ڈاکٹر بٹ صاحب کے تحقیقی مضامین اخبارات اور جریدوں کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں مؤقر انگریزی روزنامہ 'ڈان' کے Books and Review سیکشن میں ڈیپلائی صاحب کے ادبی اور صحافتی خدمات پر ایک طویل تحقیقی مقالہ شائع ہوا ہے۔وہ رقمطراز ہیں:

"..... His short stories and plays largely depict the true picture of happenings around 'Havellis' of Pirs and Mirs and the miserable plight of the poor (peasant) and illiterate Murid. He worked consistently and fearlessly in accordance with what he witnessed

around him He could apply himself ungrudgingly and unsparingly- failure was unknown to him. In 1938 he set about founding the Islamic Dar-ul-Ishaat at MirpurKhas with a paltry sum of Rs 50, borrowed from friends and well wishers. Then he wanted to arouse social, economic and political awakening among the masses of Sindh particularly the Muslim youth at the most difficult time of the history of the sub- continent."

عبدالواحد آریسر

سندھی زبان وادب اور سیاسی بیداری کے حوالے سے عبدالواحد آریسر کا نام محتاج تعارف نہیں ۔ڈیپلائی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''۱۹۶۸ء کا زمانہ تھا میں ان دنوں ایک دینی مدرسے میں پڑھتا تھا لیکن میرے دل میں سندھی ادب اور سندھ کی قومی جدوجہد کے لیے بے پناہ لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ اس لیے سندھی ادیبوں کی کسی بھی سرگرمی اور کسی بھی جلسے میں شرکت کرنا میرے شوق وجذبے کا مسئلہ بن گیا تھا۔ چنانچہ ایک ایسے جلوس میں شریک ہوا جس کی قیادت محمد عثمان ڈیپلائی، قاضی فیض محمد، زرینہ بلوچ اور کئی دوسری نامور شخصیات کررہی تھیں۔ یہ جلوس ''روح رحان'' کے دفتر گاڑی کھاتے سے نکل کر شہید ہوشو کی قبر پر حاضری دیتا ہوا اس وقت کے ڈی سی عثمان علی عیسانی کے دفتر کی حدود میں ختم ہوا۔''

مقصد اس جلوس کا شیخ ایازؔ اور رسول بخش پلیجو کی گرفتاری کے خلاف ادیبوں اور شاعروں کے سخت احتجاج کو حکومت پاکستان تک پہنچانا تھا اور اس کے قائدین میں ڈیپلائی صاحب کی شمولیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سندھ کی قومی جدوجہد میں پیش پیش رہنے والے ادیب تھے۔

یوسف شاہین

ہفت روزہ 'برسات' میں یوسف شاہین کا مختصر مضمون نومبر۔دسمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ صاحب مضمون نے مشہور ناول نگار ارینسٹ ہیمنگوے کے نوبل انعام یافتہ ناول کا عنوان 'بوڑھا

اور سمندر (Old Man and the Sea) اپنے مضمون کے لیے اخذ کیا ہے۔ ڈیپلائی صاحب کو 'بوڑھے ملاح' سے تشبیہ دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''آزادی سے پہلے سندھی ادب میں نئے عزم، نئے ولولے اور نئے جوش وخروش سے نمودار ہونے والے محمد عثمان ڈیپلائی آج بھی اسی جذبے سے قلمی جہاد کررہے ہیں۔ چالیس برس پہلے انہوں نے اپنے پڑھنے والوں کو پہلی کتاب دی تھی جس کے بعد تحریر کا، ایک دریا سا بہہ نکلا۔ کیا کیا نہ لکھا۔ افسانے، ڈرامے، ناول، مضمون، تفسیر، تشریح اور بہت کچھ غریب وسادہ مردِ حری، نہ مال و متاع، نہ دولت نہ جاگیر لیکن دلیرایسے کہ دریا میں رہتے ہوئے مگر مچھ سے بیر۔ کاش ایسی مردانگی آنے والی نسلوں کو بھی ورثے میں ملے۔ کاش اس دھرتی کی کوکھ سے ہر دور میں ایک ڈیپلائی جنم لیتا رہے۔ کاش ادب کا یہ شہسوار کبھی بھی ہم سے جدا نہ ہو۔''

اسی خراجِ عقیدت کے تسلسل میں یوسف شاہین نے ڈیپلائی صاحب کی عظمت کا یہ پہلو اُبھارا ہے کہ وہ نامساعد حالات کے باوجود تمام دکھ درد سہتے ہوئے سندھی ادب کی جھولی کو موتیوں سے بھرتے رہے اور خود کو خالی ہاتھ رکھا۔

فضل احمد بچانی

ڈیپلائی صاحب نے واقعی جیتے جی اپنی نگارشات اور پُر ایثار عملی زندگی سے بعد کی نسلِ نو کو اتنا متاثر کیا کہ جب انہوں نے وفات پائی تو جواں فکر و جواں سال سندھی اہلِ قلم نے اپنی تحریروں میں رسمی تعزیت سے کہیں زیادہ یہ تاثر دیا ہے کہ ہمارے قول وعمل میں وہی اوصاف اجاگر ہوں جو مرحوم ومغفور میں تھے۔ مثال کے طور پر فضل احمد بچانی لکھتے ہیں:

''موت سے مفر کسی کو نہیں مگر محمد عثمان ڈیپلائی جو اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ایسا لگتا ہے جیسے درحقیقت وہ ایک شمعِ روشن کی طرح تھے جو اب بجھ گئی ہے۔ وہ ایک کھلی کتاب تھے جو بند ہوگئی، وہ ایک ستون تھے جو زمیں بوس ہوگیا۔ سندھ میں ایسے انمول موتی پیدا ہوتے رہیں گے مگر ان جیسا آزاد حق پرست مرد کہاں پیدا ہوگا۔ وہ سدا بہار شخصیت، اس مردِ قلندر کی شخصیت اور فن پر

جتنا کچھ لکھا جائے وہ کم ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اُن کی کتابوں کا بڑا چرچا تھا، ہر طرف بول بالا تھا۔''

جی تو چاہتا ہے کہ نقد و نظر کے طور پر بچانی صاحب کے پورے مضمون کا ترجمہ پیش کر دوں مگر پیش نظر کتاب کی تنگی دامانی کا لحاظ رکھتے ہوئے جستہ جستہ عبارتوں کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں مثلاً یہ کہ'' ڈیپلائی صاحب ذاتی حیثیت میں بڑے سادہ، تکلفات سے بے نیاز اور فقیر منش انسان تھے۔ سندھ کی سماجی برائیوں اور مذہب کے نام پر سادہ لوح عوام کا جو استحصال ہو رہا تھا اس کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے جو عملی و قلمی جہاد ڈیپلائی صاحب نے کیا وہ ایک بڑی انقلابی مہم کا آغاز تھا۔ اس کا اثر تھا کہ سندھ کی فضاؤں سے اندھیروں کے کتنے ہی کالے کالے بادل چھٹ گئے۔ ادب و صحافت کے ذریعے اجتماعی و قومی مقاصد کی بجا آوری کے لیے مفید خدمات انجام دینے والوں میں ڈیپلائی صاحب سب سے آگے تھے۔ ان کی کسی بھی تحریر میں محض دل کے ارمانوں کا پرچار اور سطحی واویلا نہیں ملے گا بلکہ ہر تحریر میں کوئی نہ کوئی انقلابی اور تعمیری پہلو ضرور اجاگر ہوتا ہے۔

مضمون کے آخر میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:۔

''۱۹۵۷ء میں حیدر آباد کے ادیبوں نے ایک ادبی کنونشن کا اہتمام کیا جس کی صدارت کے لیے کراچی سے شیخ عبدالمجید سندھی کو لے آئے۔

سمپوزیم کی تین نشستیں ہوئیں۔ ایک تقریروں کی، ایک مقالوں کی اور ایک افسانوں کی۔ ڈیپلائی صاحب کا نام تینوں نشستوں میں تھا۔

جب مقالات کی نشست میں ان کا نام پکارا گیا تو وہ اسٹیج پر آنے کی بجائے اپنی کرسی پر ہی بیٹھے شیر کی طرح گرجے۔ ان کی آواز ہر طرف گونجی۔

''شرم کی بات ہے جو ہماری ادبی تقریب میں بھی حکومت کے جاسوس آ کر گڑبڑ کرتے ہیں۔ ادبی محفلوں سے سی۔ آئی۔ ڈی کے جاسوسوں کا کیا بگڑتا ہے وہ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟''

ہم نے پیچھے نظر دوڑائی تو واقعی آخری نشستوں پر داڑھیوں والے تین شرکاء کاغذ اور قلم سنبھالے بیٹھے ہیں اور ڈیپلائی صاحب یہی عالم دیکھ کر انہیں للکارنے لگے ہیں، ہم نے تو انہیں صحافی سمجھا تھا۔

جب کچھ وقت تک کوئی نقل و حرکت دیکھنے میں نہ آئی تو ڈیپلائی صاحب نے پھر آواز بلند کی ''میں کہتا ہوں کہ یہ سی۔آئی۔ڈی والے فوراً اُٹھ کر چلے جائیں۔ میں کہتا ہوں اُٹھو اور چلتے بنو، نہیں تو ہم احتجاجاً اجلاس ملتوی کر کے کمشنر ہاؤس تک مارچ کریں گے۔''

سی۔آئی۔ڈی والے بڑے پیچ و تاب کھاتے ہوئے مجبوراً وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے جس کے بعد ڈیپلائی صاحب اپنی کرسی سے اُٹھ کر اسٹیج پر آئے اور بڑی دلجمعی سے تقریر کی''۔

''سندھ مانک موتی تنظیم''

ڈیپلائی صاحب کی شخصیت اور ادبی صحافتی کارناموں پر موصوف کی زندگی میں ہی مضامین و مقالات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا پھر ان کی وفات کے بعد اتنا کچھ لکھا گیا کہ اگر تمام تحریروں کو یکجا کیا جائے تو کئی کتابیں مرتب کی جا سکتی ہیں تاہم فی الوقت اس کتاب کا اجمالی تعارف مجھ پر واجب ہے جس سے مدد لیتے ہوئے پیشِ نظر کتاب کی تکمیل ممکن ہو سکی۔

اس کتاب کا نام ہے''انسان دوست ادیب اور بیباک صحافی۔محمد عثمان ڈیپلائی'' اور جیسا کہ ابتدائی معروضات میں بیان کر چکا ہوں کہ یہ پیشکش ہے''سندھ مانک موتی تنظیم'' کے سرپرست اعلیٰ جناب محمد عثمان منگی کی اور ترتیب و تدوین کا فریضہ معروف ادیب اور سندھی لینگویج اتھارٹی کے سیکریٹری جناب تاج جویو نے ادا کیا ہے۔

محمد عثمان منگی

محمد عثمان منگی نے ڈیپلائی صاحب کے بارے میں جو مضمون شاملِ اشاعت کیا ہے اس کا عنوان ہے ''ترجو ماٹھون ۔اکیلو ماٹھون (تھر کا آدمی ۔اکیلا آدمی)

مضمون کا آغاز بڑے خوبصورت انداز میں کچھ اس طرح کیا گیا کہ:

''ایک ایسا انسان جس کا جنم تھر کے شہر ڈیپلو میں ہوا جہاں کی سرزمیں ریت کے ٹیلوں سے گھری ہوئی ہے۔ وہ ریتیلے ٹیلے جن پر پڑے نقوش قدم بھی مشکل سے ظاہر ہوتے ہیں وہاں ایک انسان نے اپنے قدموں کے نشان ایسے تو روشن اور نہ مٹنے والے چھوڑے ہیں جو کہ صدیوں تک نہ مٹیں گے اور جن کے کام اور کارنامے دیکھ کر آنکھوں والے عبرت حاصل کرتے رہیں گے۔''

اس خراج تحسین کے بعد ڈیپلائی صاحب کے سوانحی حالات اور علم وادب کے ذوق وشوق کا بیان ہے پھر اپنے حوالے سے عقیدت مندانہ تعلق خاطر کا اظہار۔

''میں نے جب محمد عثمان ڈیپلائی کی تصویر دیکھی تو مجھے ان کی پیشانی اور چہرے پر غربت اور زمانے کی ستم ظریفیوں کے نقش ونگار نظر آئے اور میں نے اندازہ لگایا کہ اس انسان نے کیسی محنت اور جدوجہد کی ہے۔ بغیر کسی نمود ونمائش کے، وہ اپنے دل اور ضمیر کی تالیف اور غریب عوام کی خدمت کے لیے۔ لوگوں میں فکر وعمل کی بیداری کا جذبہ اُبھارنے کے لیے اور ذہنی تربیت کے لیے جو قلمی جہاد کرتا رہا۔ علم وادب کے جو موتی رولتا رہا اور کتابی علم کو عام کرتا رہا اس کی مثال نہیں ملتی۔''

مضمون نگار نے اپنے ممدوح کے قریب قریب سبھی تصنیفی وتالیفی کارناموں کا تذکرہ بڑے پُرخلوص و پرکشش انداز سے کیا ہے، جو حقائق پیش کیے گئے ان کی صداقت میں کوئی شک نہیں یقیناً ایسی نابغۂ روزگار مثالی شخصیت ملک وقوم کے لیے باعثِ افتخار ہوتی ہیں اور یہ کہنا بجا ہے کہ:

آج ڈیپلائی ایک شخص نہیں بلکہ ایک ادارہ ہیں، ایک فکر، ایک نظریہ اور ایک راہِ فلاح کا نام۔ وہ انسانیت کے مبلّغ رہے۔ انہوں نے ہمیشہ سچ لکھا اور سچ کہا جس کی پاداش میں جیل گئے، کتابیں ضبط کرائیں لیکن تھر کے سچے آدمی، اکیلے آدمی اور اکیلی جان نے ہزاروں دشواریوں کا سامنا کیا اور تازندگی نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے رہے نہ تھکے اور نہ حوصلہ ٹوٹا، نہ مایوس ہوئے نہ تھک ہار کر بیٹھ گئے بلکہ پوری زندگی کوشش پیہم اور جدوجہد میں گزاری۔ کوئی بھی مال ومتاع اپنے پیچھے نہ چھوڑا بس ۱۵۰ کتابوں کا سرمایہ اور صالح اولاد۔ علم وادب سے مالا مال۔

''ان کے قلم کی نوک مضبوط تھی جس کی روشنائی زندگی بھر خشک نہ ہوئی۔ ایسے صاحب قلم جن

کو پوری سندھ دھرتی یاد رکھے گی، جن کا نام علمی و ادبی حلقوں میں عزت اور مان شان کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ انہوں نے ہر میدان میں لکھا۔ افسانے، ڈرامے، ناول، تنقید، لطائف اور اداریے وغیرہ جن سے سندھ کے مردوں اور عورتوں میں ذہنی بیداری پیدا ہوئی، قومی شعور ابھرا۔ وہ سچ اور روشنی کا استعارہ تھے۔"

تاج جویو

اب میں قارئین کو جناب تاج جویو کے تاثرات سے بہرہ ور کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے بڑی محنت اور یکسوئی سے ڈیپلائی صاحب کے بارے میں (۵۶۰) پانچسو ساٹھ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم دستاویزی کتاب ترتیب دی۔

میرا خیال ہے یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں سندھی، اُردو اور انگریزی میں جو مضامین و مقالات ہیں وہ شخصیت کے بیشتر سوانحی حالات اور ادبی کارناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں۔

تاج جویو نے اپنے مضمون کا عنوان "منھنجو اتساھ، منھنجو ویساھ" (یعنی میرا جذبہ، میرا ایمان) رکھا ہے۔ بقول ان کے:

"ڈیپلائی صاحب ادب اور صحافت کی دنیا کے کثیر الجہات شخص تھے۔ انہوں نے ادب و صحافت کے وسیلے سے سندھ میں بڑا تحرک پیدا کیا اور تغیر بھی۔ ان کی تحریروں میں اتنا اثر اور دلکشی ہے جو ان کی زندگی کے دونوں ادوار یعنی مذہبی دور اور ترقی پسندی کا دور سندھی عوام اور ادیبوں کے لیے اثر آفریں اور پُرکشش رہے ہیں۔

"ڈیپلائی صاحب جب مکمل مذہبی انسان تھے تب بھی انہوں نے غریب عوام کو سماجی جونکوں، ملاؤں، پیروں، زمینداروں، نوکر شاہی کے کارندوں، سود خور مہاجنوں، سیٹھوں اور کنز مہا سبھائیوں کی برائیوں اور بداعمالیوں سے بچانے کے لیے قلم کو ذریعہ بنایا اور جب روشن خیالی اور ترقی پسندی کو اپنا کر محب وطن سندھی بنے تب بھی وہ سندھ سے وہم پرستی، پیر پرستی اور دیگر

استحصالی چیرہ دستیوں سے سندھی عوام کو بچانے کے لیے اپنے قلم کی طاقت کام میں لاتے رہے۔''

''انہوں نے ۱۹۱۹ء سے قلم سنبھالا تو زندگی کے آخری لمحوں تک لگاتار ۶۲ سال اس کی حُرمت کو سلامت رکھا، کبھی بھی مصلحت کوشی یا موقعہ پرستی سے کام نہیں لیا۔ جو کچھ لکھا اس پر ان کا ذہن اور ضمیر مطمئن رہا وہ وقت اور حالات کے تقاضوں یا تبدیلیوں کے مطابق اپنے طور پر سوچتے تھے۔ خیالات کے تبدیل کرنے کو عیب نہ سمجھتے تھے۔ وہ وقت کے بڑے نبض شناس ادیب تھے۔''

ڈیپلائی صاحب۔ بڑے نقاد بھی تھے۔ انہوں نے 'شاہ جو رسالو' اور شیخ ایاز کی شاعری پر جو فکر انگیز مضامین لکھے وہ ان کی تنقید نگاری کے اہم حوالے ہیں۔ ان کی مزاح نگاری کا بھی ایک مخصوص انداز ہے۔

تاج جویو نے نہ صرف اس کتاب سے بہت سے سندھی، اردو اور انگریزی اہل قلم کی نگارشات کو یکجا کیا ہے اور خود اپنے تمہیدی مقالے میں ان کی نثر نگاری کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ جن میں چند اچھوتے پہلو بھی ہیں جو افسانہ نگاری، ناول نویسی، ڈرامہ نگاری اور مضمون نویسی وغیرہ سے الگ ہیں مثلاً مکتوب نگاری اور مشاہدہ نگاری۔

مکتوب نگاری کے بارے میں تاج جویو لکھتے ہیں:

''خطوط نویسی کو ادبی دنیا میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سندھی میں سائیں جی۔ ایم سید، علامہ آئی۔ آئی قاضی، شیخ ایاز، محمد ابراہیم جویو، طارق اشرف اور کئی دوسرے ادیبوں کے خطوط کی کتابیں شائع ہو کر بڑی مقبولیت پا چکی ہیں۔ ڈیپلائی صاحب نے بھی دوستوں کو بڑے دلچسپ اور معلوماتی خط لکھے ہیں جن کی ایک عمدہ کتاب شائع ہو سکتی ہے''۔

اس کتاب میں ان کے دوست ابراہیم جویو کو لکھے گئے چار خط، اور رئیس کریم بخش نظامانی کو تحریر کردہ ایک خط شامل کیے گئے ہیں جن سے مکتوب نگار کے نرالے طرزِ تحریر کا اندازہ ہو جائے گا۔

''ڈیپلائی صاحب مشاہدہ نگار بھی بڑے تھے۔ ان کی مشاہدہ نگاری اور منظر کشی کا حسن 'جیل کے مشاہدات' والی تحریروں میں نمایاں ہے۔ وہ تین مرتبہ جیل گئے۔ اس جیل یاترا میں انہیں جو

معلومات حاصل ہوئیں وہ افسانوی زبان میں بڑی دلکش کہانیوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ جنہیں ایک الگ کتاب کی صورت میں شائع ہونا چاہیے۔

زبان و بیاں پر ڈیپلائی صاحب کو جو عبور حاصل تھا اس کا ذکر بیشتر تبصرہ نگاروں نے کیا ہے۔ تاج جویو کے نزدیک بھی موصوف میں یہ خوبی بڑے کمال کی تھی۔

ناول، افسانہ اور ڈرامہ ان کی پسندیدہ اصناف تھیں۔

''انہوں نے سو کے قریب ناول اور ۱۴ ڈرامے لکھے۔ اتنی بڑی تعداد میں ناول لکھ کر موصوف نے ثابت کیا ہے کہ وہ سندھ کے بڑے سے بڑے ناول نگار ہیں جدید دور میں گو بند مالھی کو ''ناول سراٹ'' کہا جاتا ہے جنہوں نے ۳۶ ناول لکھے، اس حوالے سے ڈیپلائی صاحب کو 'ناول کا بادشاہ' کہہ سکتے ہیں۔''

ڈیپلائی صاحب کے تحریر کردہ ڈراموں کے بارے میں تاج جویو کا تحقیقی تاثر یہ ہے کہ'' ان کے ڈرامے کافی تعداد میں اسٹیج پر بھی پیش کیے گئے اور بہت مقبول ہوئے۔ ڈرامہ نگاری میں وہ اپنا ایک منفرد رنگ رکھتے تھے جو دوسروں میں مشکل سے ملے گا''۔

''ڈیپلائی صاحب کی مضمون نگاری بھی اپنی صفات میں یکتا ہے۔ مضامین کے موضوع پر ان کی گرفت، زبان کا بناؤ سنگھار، دلکش طرز ادا اور سلاست و روانی غضب کی ہوتی ہے۔ ان کے چند اہم مضامین مثلاً ''لطیفی دیگ کا ڈھکن اُتارنے والے حضرت پچل سرمست''، ''شہید انسانیت، ابراہام لنکن'' اور ''میرے رہبر مولانا دین محمد وفائی'' کو پڑھ کر ان کے منفرد اسلوب بیاں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

انہوں نے لطیفیات، نفسیات، تاریخ، لسانیات، شخصیات اور دینیات کے حوالے سے بھی سندھی میں بڑا کام کیا ہے۔ بیسویں صدی میں مرزا قلیچ بیگ کے بعد دوسرا نمبر انہیں کا ہے۔ تاہم مرزا قلیچ بیگ نے ہر موضوع پر سندھی میں مواد پیش کر کے سندھی زبان کی بڑی خدمت کی ہے جبکہ ڈیپلائی صاحب نے مقصدی ادب تخلیق کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کا اپنا منفرد مقام

ہے۔انھوں نے زیادہ سے زیادہ مذہبی ادب کا ترجمہ کیا لیکن ان کے ترجمہ کیے ہوئے ترقی پسند تحریک اور حقیقت نگاری سے تعلق رکھنے والے ناول مثلاً میکسم گورگی کا ناول 'ماں' اور کئی دوسرے شاہکار مغربی ناولوں کے تراجم مثالی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن سے ڈیپلائی صاحب کا نام سندھی ادبی دنیا میں نہایت سر بلند ہے''۔

مضمون نگار نے جس عبارت پر اختتامی معروضات کا اظہار کیا ہے اس کا یہ حصہ بڑا نتیجہ خیز ہے۔

''ڈیپلائی صاحب کی نگارشات جہاں سندھ کے اکثر روشن خیال ادیبوں کے لیے حوصلہ افزا ذریعہ بنی ہیں وہاں مجھے بھی ڈیپلائی صاحب کی تحریروں سے حوصلہ ملا ہے اور خود اعتمادی میں اضافہ ہوا ہے۔ بیشک ڈیپلائی صاحب کا نام سندھی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہماری آئندہ نسلیں بھی ان کی تخلیقات سے مستفیض ہوں گی۔''

محمد علی ڈیپلائی

ڈیپلائی صاحب کا فکری سفر

محمد علی ڈیپلائی نے اپنے والد بزرگوار کی شخصیت اور کارناموں پر بہت کچھ لکھا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ان کے تحریر کردہ مضامین میں 'فکری سفر' والا مضمون اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کا تعلق براہ راست مرحوم کی تصنیفی زندگی سے ہے۔مضمون کا پہلا حصہ جماعت اسلامی کی وابستگی کا آئینہ دار ہے اور اس کا ابتدائیہ کچھ اس طرح ہے کہ:

''ڈیپلائی صاحب کی نگارشات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۳-۱۹۴۲ء کے عرصے میں وہ مولانا مودودی کی تحریروں اور 'حکومت الاھیۂ' کے تصور سے بہت زیادہ متاثر تھے۔مولانا مودودی کے خیالات کی ترجمانی اور ان کا ذکر وہ اپنی کتابوں اور ہفت روزہ 'عبرت' میں اکثر کرتے رہتے تھے علاوہ ازیں مولانا کے لیکچروں اور مضامین کا سندھی میں ترجمہ بھی شائع ہوتا رہتا تھا۔

اس دور میں ڈیپلائی صاحب کے ذاتی رابطے جماعت اسلامی کے اہم عہدیداروں چودھری

غلام محمد سے بہت گہرے بلکہ برادرانہ ہو گئے تھے۔ ڈیپلائی صاحب ان کی شخصیت اور اخلاق سے بے حد متاثر ہوئے۔

ڈیپلائی صاحب نے ذاتی پریس ۱۹۴۸ء میں قائم کیا وہ پریس گویا جماعت اسلامی کے واسطے مخصوص ہو گیا۔ اور ڈیپلائی صاحب یکے بعد دیگرے دھڑا دھڑ مودودی صاحب کی کتابوں کا ترجمہ کرتے رہے اور چھاپ چھاپ کر سندھ میں پھیلاتے گئے۔

اسی دور میں دوسری اسلامی کتابوں کے علاوہ مودودی صاحب کی ۲۱ کتابوں اور کتابچوں کے تراجم کتابی صورتوں میں لائے گئے جس میں درج ذیل قابل ذکر ہیں۔

(۱) قرآنی انقلاب (۲) اسلام کا سیاسی نظریہ (۳) سلامتی کا راستہ (۴) کلمۂ پاک کی حقیقت (۵) خطبات اسلام (۶) اسلام اور ایمان، مودودی صاحب کی کتابوں کے علاوہ جماعت اسلامی کے دوسرے عالموں کے افسانے اور ڈرامے وغیرہ بھی ڈیپلائی صاحب نے ترجمہ کئے اور ان کی اشاعت ہوئی۔ ان میں نعیم صدیقی کا ڈرامہ 'اسلام پر مقدمہ' اور افسانہ 'جوڑی' قابل ذکر ہیں۔

وقت کا بھی عجیب نظام ہے جماعت اسلامی کو سندھ میں متعارف کرنے کا صلہ ڈیپلائی صاحب کو بڑا عبرت ناک ملا۔ ۱۹۷۲ء والے لسانی فسادات میں ڈیپلائی صاحب کے قرآن پریس اور اسلامیہ پرنٹنگ پریس کو آگ لگا دی گئی۔"

خان محمد پنہور

ڈیپلائی کی صحافتی زندگی

یہ عنوان ہے جناب خان محمد پنہور کے ایک مضمون کا جو ۳۰ رنومبر ۱۹۷۸ء کو روزنامہ ہلال پاکستان کراچی میں شائع ہوا تھا۔

مضمون نگار بذات خود ادب وصحافت کی دنیا میں مشہور و معروف تھے اور سندھ یونیورسٹی ج م شورو کے شعبۂ صحافت کے مثالی معلم تھے۔

ابتدائی دور میں ڈیپلائی صاحب جن سندھی اخباروں میں لکھتے رہے وہ 'مخلص'، 'مسلمان' اور'بیداری' کے نام سے نکلتے تھے۔اُردو جریدوں میں 'دین دنیا' اور'منادی' دہلی میں ان کی تحریریں چھپتی تھیں۔

صحافت سے ان کی وابستگی اصلاحی مقاصد کاذریعہ تھی اس لیے بقول خود''اپنا صحافتی شغل جاری رکھنا اور صحافت کے ذریعے سندھی لوگوں کی خدمت کرنا'' ان کا مشن تھا جس کو مضمون نگار نے بھی خاطر خواہ اہمیت دیتے ہوئے تحریر کیا کہ:

''۱۹۴۱ء میں انہوں نے ماہنامہ 'عبرت' کا ڈیکلریشن حاصل کیا جسے آگے چل کر ۱۹۴۵ء میں ہفت روزہ اور ۱۹۵۳ء میں روزنامہ بنادیا۔''

۱۹۵۳ء میں ایک اور اخبار ماہنامہ 'انسان' جاری کیا اور'ادارۂ انسانیت' شروع کیا۔ان دونوں رسالوں کے ذریعے سندھ میں مرّوج بعض قبیح رسموں کے خاتمے اور سندھی معاشرے کے سدھار کی غرض سے انہوں نے باقاعدہ جہاد کیا جس کے لیے کافی سختیاں بھی برداشت کرنا پڑیں اور ۱۹۵۸ء میں جیل کے حوالے کیے جانے کے سبب مالی مشکلات کا سامنا بھی رہا جن کی وجہ سے 'عبرت' اخبار کو قاضی برادران (قاضی محمد اکبر اور قاضی عبدالمجید عابد) کے ہاتھوں فروخت کرنے کی نوبت آئی۔پھر جیل سے رہائی پانے کے بعد''ادارۂ انسانیت'' اور ہفتہ وار جریدہ 'انسان' پر خصوصی توجہ دی۔

''۱۹۶۹ء کے بعد ڈیپلائی صاحب نے ہفت روزہ 'سندھ ٹائمز' جاری کیا جس کو ۱۹۷۰ء کے بعد روزنامہ کر دیا۔مالی مشکلات اور سرکاری سرپرستی سے محرومی کا سامنا رہا۔اشتہارات بھی نہ ملے مگر اس کو جاری رکھا۔

ایک سندھی رسالہ'' ساینھ ڈائجسٹ'' بھی نکالا جس میں کافی علمی، ادبی اور تاریخی مضامین ہوتے تھے۔وہ نوجوان نسل اور اس کی ہمت سے مطمئن تھے مگر سندھی صحافت سے زیادہ خوش نہ تھے۔''

ڈیپلائی صاحب کی صحافتی زندگی کے مختصر ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے کس جدوجہد،

لگن اور محنت سے سندھی صحافت اور ادب کی خدمت کی ہے۔

خان محمد پنھور نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ہم اپنے اکابرین علم و ادب کی خاطر خواہ قدر دانی میں بڑی کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ڈیپلائی صاحب کے کارناموں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے وہ اس کوتاہی کا احساس بھی دلاتے ہیں۔

''بہر حال ڈیپلائی صاحب سندھی ادب و صحافت کے ایک دور کا نام ہیں جس دور کے اپنے معیارات اور پیمانے تھے وہ دور ہماری تاریخ کا ایک خاص اور ناقابل فراموش حصہ ہے۔ اس دور نے ہمارے لیے کافی راستے اور راہیں پیدا کی ہیں ہم ان راہوں اور راستوں پر چلتے ہوئے اپنی راہیں بنا رہے ہیں۔

'افسوس' یہ ہے کہ ہم اپنے ایسے بزرگوں، عالموں، ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی قدر نہیں کرتے۔ یہ انسان دوسرے ملکوں میں پیدا ہوتے تو ان کے نام پر اکیڈمیاں، ادارے اور پذیرائی کے کیا کیا کام کئے جاتے لیکن ہمارے اکابرین علم و ادب میں جو ڈاکٹر داؤد پوتہ سے لے کر مولائی شیدائی، گدائی اور الطاف عباسی تک اپنے قابل قدر کارنامے انجام دے کر رخصت ہو گئے لیکن ہم نے ان کی زندگی میں کوئی قدر نہ کی۔''

مضمون نگار نے مندرجہ بالا شخصیات کے علاوہ شیخ عبدالمجید سندھی، پیر حسام الدین راشدی، مولوی خیر محمد نظامانی، عبدالرحمٰن سورائی اور کئی دوسرے اہل علم و دانش کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ:

''یہ حضرات اپنی جگہ اداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی زندگیاں تاریخ ساز ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کی سوانح حیات قلمبند کریں۔ اگر زندہ اکابرین میں سے کسی کو مالی پریشانی ہو تو مدد کریں یہی زندہ قوموں کا طریقہ ہے اور ہم پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے بزرگوں کی قدر و منزلت کے ممکنہ طور طریقے اپنائیں کیونکہ یہ جیتی جاگتی تاریخیں ہیں۔''

پروین موسیٰ میمن

پروفیسر پروین موسیٰ میمن اور ان کے تحقیقی کارناموں کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اب

اُن کی ایک اور تحقیقی کتاب "سنڌي ادب جو جائزو ۽ لطيفيات" (سندھی ادب کا ادبی جائزہ اور لطیفیات) کے حوالے سے ڈیپلائی صاحب کے بارے میں جو باب ہے اس کا اجمالی جائزہ کچھ یوں ہے کہ سب سے پہلے تعارفی سوانحی کوائف پھر علمی و ادبی خدمات کا احوال جس میں موصوفہ نے تحریر کیا ہے کہ "ڈیپلائی صاحب نے ہر صنف ادب پر طبع آزمائی فرمائی ہے اور مقصدی ادب تخلیق کرتے ہوئے ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں اور پانچ سو سے کہیں زیادہ مضامین لکھ کر مضمون نگاری میں بہترین اضافہ کیا ہے۔ ان کے مضامین کی زبان عام فہم، سلیس اور منفرد ہے۔"

پروین موسیٰ نے بڑی تفصیل سے ڈیپلائی کے ابتدائی دور کے مذہبی

تصانیف و تراجم اور مضامین کے حوالے دیے ہیں پھر ان کے ادبی خطوط اور شاہ لطیف کے کلام سے والہانہ دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ انہوں نے بڑے سلیقے سے پاکٹ سائز میں "شاہ جو رسالو" کو شائع کرایا۔ قرآن پاک کا سندھی میں ترجمہ کیا، قرآن پریس قائم کیا جس کے ذریعے مذہبی کتابوں کی اشاعت ہوئی۔

افسانہ نگاری اور ڈراموں کے بارے میں پروین نے یہ لکھا ہے کہ "ڈیپلائی صاحب ایک بہترین مشاہدے اور حافظے والے قلمکار تھے۔ ان کے جیل کے مشاہدات پر مبنی تحریریں سندھی ادب میں اہم حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ انہوں نے افسانوی انداز میں ان کو پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں کی ۱۴ کتابیں شائع ہوئیں۔"

ڈرامہ نگاری کے سلسلے میں پروین نے مرزا قلیچ بیگ اور ڈیپلائی صاحب کے ڈراموں کا موازنہ کرتے ہوئے یہ تاثر رقم کیا ہے کہ "مرزا صاحب نے جو ڈرامے لکھے ان میں طبعزاد ڈراموں سے زیادہ تعداد شیکسپیئر کے ڈراموں کی سندھی تشکیل سے عبارت ہے۔ باوجود بہترین تراجم ہونے کے ان ڈراموں میں انگلستان کے ماحول اور مناظر کی جھلک ہے مگر ڈیپلائی صاحب کے ڈرامے طبعزاد ہوتے ہوئے سندھی ماحول اور سندھی سماج کو عمدگی سے پیش کرتے ہیں اور ان میں سندھی سماج کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔"

نورالھدیٰ شاہ

(ڈیپلائی صاحب کے نام)

سچ کا دیپک

محترمہ نورالہدیٰ شاہ جدید سندھی ادب کی ایک ممتاز شخصیت کے طور پر جانی پہچانی جاتی ہیں۔ انہوں نے صاحب طرز افسانہ نگار کی حیثیت سے شاہکار افسانے لکھے۔ ٹیلی ویژن کے لیے ان کے تحریر کردہ ڈرامے بھی عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ ڈیپلائی صاحب کے لیے منظوم خراج عقیدت کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

سچ کا دیپک
سرخ آنچل کی چھاؤں میں
جلایا ہے ___
دیپک سچ کا
بجھ نہیں سکتا
دھرتی کی نسوں میں
میرا لہو
تیل کی طرح
جل رہا ہے
بدن سارا
جیسے
سندھو دھرتی کا خاکہ
نین میرے
بجھنے سے پہلے
جل اُٹھے تا کہ
دھرتی کی چھاتی پر
جو کچھ بھی ہے

آرسی کی طرح دمکتا رہے
شاگردوں کی آنکھوں میں روشن
سیاہ دھندلکا
ہاریوں کی پیشانی پر دمکتے
پسینے کا قطرہ
دھرتی کی چھاتی پر
سنہرے سورج کے ساتھ
جگوں تک جلتا رہے گا
سچ کے دیپک کی چھاؤں میں چلنے والا
انسانوں کا قافلہ
جن کے قدموں کے نشان
پیچھے رہ جانے کے بعد
سچ کا راستہ بن جاتے ہیں
وہ نشان
کاش جگوں تک
روشن رہیں
میرے دیس کے باسی
اس دیپک کے اُجالے میں
کاش جاگتے رہیں
جو اس دھرتی کے دُکھ لکھیں
وہ اُنگلیاں
کاش جلتی رہیں

☆

بندوق کی ایک گولی
لکھنے والوں کی انگلیوں سے

باہر نکلے گی
بندوق کی وہ گولی

اب
دھرتی کا فیصلہ کرے
اور سچ کا دیپک
جگوں تک
بجھ نہ سکے گا

آفاق صدیقی

ڈیپلائی صاحب ہمہ جہت ادیب اور بے باک صحافی

دنیائے علم و ادب میں یہ مثال کم ہی ملے گی کہ کسی بلند پایہ شخصیت کو اپنے وطن اور جائے ولادت سے ایسی نسبت ہو کہ وہی مکانی نسبت اصل نام کے بجائے شخصیت کی پہچان بن جائے۔ عظیم شخصیات کی کہکشاں میں 'ڈیپلائی' وہ ممتاز ادیب، صحافی اور مجاہد فکر و عمل ہیں، جن کا نام تو محمد عثمان ہے، مگر تھر پارکر کے بے آب و گیاہ ریگزار میں ڈیپلو نام کی بستی میں جنم لینے کے سبب انہوں نے اسے اپنے نام میں اس طرح شامل کیا کہ تمام تر شہرت و مقبولیت 'ڈیپلائی' بن گئی۔

۱۳ جون ۱۹۰۸ء کو ان کی ولادت ہوئی۔ والد کا نام حبیب اللہ ہے، جو ڈیپلو میں محنت و مشقت سے اپنے کنبے کی کفالت کرتے تھے۔ علمی و ادبی کتابیں پڑھنے کا ذوق و شوق تو تھا، مگر بذات خود شاعر و ادیب نہیں تھے۔ خالق حقیقی نے ان کے ہونہار بیٹے کو غیر معمولی ذہانت و فطانت سے نوازا تھا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت خانگی ماحول میں ہوئی۔ پھر ڈیپلو میں ہی سندھی کی ساتویں جماعت تک اپنی تعلیم کو جاری رکھ کر باپ کے کاروباری معمولات میں شریک ہو گئے۔ لکھنے پڑھنے کا جذبہ دل و دماغ میں شدت سے موجزن رہا۔ اُردو اور انگریزی کتابیں بھی پڑھیں۔ پھر نوعمری میں ہی سندھی اور اُردو کے مضامین لکھنے لگے۔ پہلا مضمون دہلی کے مشہور و معروف جریدے 'منادی' میں شائع ہوا،

تو مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ صحافت پر مائل ہوئے، جس کا پہلا نقش آٹھ سال کی عمر میں اپنے ہم جماعت دوستوں کے لیے 'فرحت آثار' کے نام سے زمانہ طالب علمی میں نمایاں کر چکے تھے۔

سن شعور کو پہنچنے کے بعد معاشی مجبوریوں نے آس پاس کی بڑی بستیوں مثلاً بدین، میر پور خاص اور عمر کوٹ میں ملازمت کرنے کے سلسلے قائم کیے، جو زیادہ تر تحریری محنت و ریاضت سے تعلق رکھتے تھے۔ منصبی فرائض ادا کرنے کے دوران اور بعد میں جو وقت بھی ملتا، اس کو پوری توجہ سے کتابیں پڑھنے اور مضامین لکھنے پر صرف کرتے۔ اس طرح سبق آموز کہانیاں اور مولانا عبدالحلیم شرر جیسے ناول نگار کے ناولوں کو پڑھ کر خداداد ذہانت، افسانوی ادب پر مائل ہوئی اور خود بھی کہانیاں لکھنے لگے۔ ۱۹۳۴ء میں پہلا افسانہ سندھی میں لکھا، جس کا عنوان تھا 'چاند حسین یا انسان'۔ ۱۹۳۴ء میں حیدرآباد کے حکیم عبدالخالق نے اس جوہر قابل کو پہچانا۔ ملاقات میں حکیم صاحب نے قرآنی دعاؤں پر مشتمل ایک کتاب لکھنے کا کام سونپا۔ یہ مسلم ادبی سوسائٹی کی پیشکش تھی، جسے انتہائی ذمہ داری اور سچی لگن سے پیش کیا گیا۔ مسلم ادبی سوسائٹی نے انعام و اکرام سے بھی نوازا۔ کتاب کا نام 'قرآنی دعائیں' تھا اور یہ پہلی کتاب بھی، جس پر نام کے ساتھ 'ڈیپلائی' کی چھاپ لگی اور ایسی لگی کہ ان کے نام اور کام کا استعارہ بن گئی۔

ڈیپلائی صاحب کی بجا طور پر پذیرائی اور حوصلہ افزائی کرنے والوں میں ایک اور شخصیت مولوی خیر محمد نظامانی کی تھی، جنھوں نے افسانوں اور ناولوں کی اشاعت کا ذمہ لیا۔ افسانوں کا پہلا مجموعہ 'گلشن عبرت' کے نام سے منظرِ عام پر آیا اور مقبول عام ہوا۔ پھر ۱۹۳۸ء میں پہلے ناول 'سنگدل شہزادی' کی اشاعت ہوئی۔ اس کے بعد تو اتنے ناول اور اتنی کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں کہ مجموعی تعداد دو سو کے قریب پہنچتی ہے۔

ابتدائی دور میں ان کی افسانوی تحریروں میں قرآنی تعلیمات کے مطابق تاریخ اسلام کا رنگ غالب رہا، 'مصطفیٰ کمال' اور 'نور توحید' جیسے ناول اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ وہ بڑے بیباک اور حقیقت نگار قلمکار تھے، چنانچہ ۱۹۴۵ء میں ان کا ناول 'ڈاھری رنگ محل' بحق سرکار ضبط ہوا

اور آ ئندہ بھی مختلف کتابیں ضبط ہوتی رہیں۔ مثلاً: 'گلستانِ حسن'، 'جاپانی گڑیا'، 'شیخ المشائخ' اور 'انور پاشا' وغیرہ۔

ناولوں میں ان کا بہترین ناول 'سانگھڑ' ہے جسے ۱۹۶۳ء میں رائٹرز گلڈ ادبی انعام ملا۔ اس طرح ان کی ایک اور انعام یافتہ کتاب 'انقلاب ایران' ہے، جسے ۱۹۸۰ء میں بہترین سندھی ناول قرار دیا گیا تھا۔ 'سانگھڑ' تو واقعی تحریک آزادی اور مہاجروں پر ڈھائے گئے بے پناہ مظالم کی بہت ہی اثر آفریں داستان ہے، جو سندھ کی تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی روح کو اپنے پیکر میں سموئے ہے۔ اس ناول پر ممتاز سندھی اہلِ قلم نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ اس کا حوالہ بھی فی الوقت نہیں دیا جا سکتا، البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر مبارک علی جیسے بے باک مورخ کے پیش لفظ کے ساتھ اس شہکار ناول کا اردو ترجمہ عنقریب منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ (سانگھڑ ناول کا اردو ترجمہ چھپ چکا ہے، جو ثریا سوز ڈیپلائی نے کیا ہے)

ڈیپلائی صاحب کی ایک اور قابلِ قدر ادبی شناخت ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ انہوں نے سماجیات کے حوالے سے تقریباً ۱۲ ڈرامے لکھے، جن میں سے بیشتر اسٹیج پر بھی پیش کیے گئے اور کتابی صورت میں بھی موجود ہیں۔ پہلا ڈرامہ ۱۹۴۱ء میں لکھا تو اس سے سماجی برائیوں اور سندھ کے سماجی مسائل کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان مسائل کو حل کرنے کی تدابیر بتانے کے لیے انہوں نے اپنی ذہانت اور بذلہ سنجی سے سنجیدہ و مزاحیہ اندازِ بیاں سے ڈراموں کو اتنا دلچسپ بنایا کہ آج بھی مطبوعہ ڈرامے پڑھ کر یہ احساس جاگتا ہے کہ اگر چند منتخبہ ڈراموں کو اردو کے قالب میں ڈھالا جائے، تو ان کی افادیت وسیع تر ہوگی، کیونکہ ان کے تراشیدہ کردار عام فہم اور سادہ زبان میں جو مکالے ادا کرتے ہیں اور شروع سے آخر تک جو مجموعی دلکشی ان کے ڈراموں میں ہے، وہ کمالِ فن اور طرزِ تحریر کی خوبیوں سے مالا مال ہے۔

افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے علاوہ ڈیپلائی صاحب کے گراں قدر کارناموں میں ایک کارنامہ قرآن حکیم کا سندھی ترجمہ ہے۔ ویسے بھی انہیں سندھی سے اردو اور اردو سے سندھی میں

ترجمہ کرنے کی بڑی مہارت تھی، جس کا ثبوت ان کی کئی کتابوں مثلاً: نورِ توحید، غازی احمد شاہ ابدالی اور انقلابِ مصر سے ملتا ہے۔

ڈیپلائی صاحب کی شخصیت سازی میں ان کی صحافیانہ سرگرمیوں کا بھی نمایاں حصہ رہا ہے۔ سندھی روزنامہ 'عبرت' جو سندھی صحافت کا ایک اہم جریدہ مانا جاتا ہے، اس کا آغاز موصوف ہی نے پہلے بطور ماہنامہ پھر ہفت روزہ کی حیثیت سے کیا تھا۔ سندھ ٹائمز اور 'سانجھ' (ڈائجسٹ) کا اجراء انہیں نے کیا۔ ماہنامہ 'انسان' جو ہفت روزہ بھی بنا اور بڑی بیباکی سے سندھی صحافت کی ترقی و توسیع میں پیش پیش رہا، اس کے اداریے اور ان کے زورِ قلم کا شاہکار ہیں، مثلاً: ۱۹۶۱ء میں جب بھارت کے شہر جبلپور سے مسلمانوں پر ہندو انتہا پسندوں کے شدید ظلم وستم کی خبریں آئیں، جن میں ظالمانہ یورش کے سبب چار سو مسلم گاؤں خاکستر ہوئے، ہزاروں مسلمانوں کے قتل اور سینکڑوں مسلم خواتین کے المناک واقعات تھے، تو ڈیپلائی صاحب نے 'کربلائے جبلپور' کے عنوان سے جو اداریہ تحریر کیا وہ اعلیٰ انسانی ہمدردی کی مثال ہے۔ اسی طرح اپنے اس جریدے کا ایک خصوصی نمبر امریکہ کے سابق صدر، ابراہم لنکن، کے نام سے منسوب کرتے ہوئے اسے 'شہیدِ انسانیت نمبر' کا نام دیا۔

کہا جاتا ہے اور یہ کہنا بجا بھی ہے کہ سندھی میں مزاحمتی ادب کی بنیاد رکھنے والے محمد عثمان ڈیپلائی تھے۔ انہوں نے استحصالی طبقوں، منافقانہ رویوں اور ہر قسم کی حق تلفیوں اور ناانصافیوں پر انتہائی جرأت مندانہ ردِعمل کا اظہار کیا۔ وہ مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں کی طرح سچے اور کھرے مجاہدِ حریت تھے۔ سیرت و کردار کی ثابت قدمی و بے باکی اور بھرپور جرأت اظہار کے سبب ڈیپلائی صاحب کو ۱۹۵۸ء، ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۶ء میں قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، مگر وہ بہر طور علامہ اقبال کے اس شعر کی عملی تجسیم بنے رہے۔!

آئینِ جواں مردی، حق گوئی، بے باکی،
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

اپنی ایثار نفسی، سادگی، انسانیت نوازی اور شجاعتِ کردار و گفتار پر قائم رہنے والے اس مردِ

قلندر نے ۷ فروری ۱۹۸۱ء کو وفات پائی ،تو سندھی ،اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کے ممتاز اہلِ قلم دانشوروں ، صحافیوں اور ان کے لاکھوں عقیدت مندوں نے تعزیت کے ساتھ بے لوث کارناموں پر دلی خراجِ تحسین وعقیدت پیش کیا۔

ڈیپلائی صاحب کی کثیر الجہات علمی وادبی شخصیت اور مجاہدانہ کارناموں کو اپنی تحریروں میں بہت سے ممتاز ومحترم اہلِ قلم نے اجاگر کیا ہے۔ان شخصیات میں جناب جی۔ایم سید، پیر علی محمد راشدی، محمد ابراہیم جویو، شیخ ایاز، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، محمود شام ، ڈاکٹر محمد علی صدیقی ،قمر شہباز ، غلام ربانی آ گرو، سراج الحق میمن ،حمید سندھی ، پروفیسر ڈاکٹر قاضی خادم، شمشیر الحیدری، ظفر حسن ، پروفیسر خان محمد پنھور، رشید بھٹی ، پروفیسر ثریا سوز ،معمور یوسفانی، ظہیر احمد، ڈاکٹر مبارک، ڈاکٹر سلیمان شیخ ، جمال ابڑو اور کئی دوسرے نام آتے ہیں۔

یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ ملک وقوم کی آزادی، عوامی فلاح و بہبود، مثبت سیاسی بیداری اور تہذیب وثقافت کے اس عظیم نقیب اور محسن کو قومی اعزازات کے سلسلے میں نظر انداز کیا گیا۔راقم الحروف سندھی اردو ادبی فاؤنڈیشن اور ڈیپلائی میموریل کمیٹی کی جانب سے عنقریب ایک تحقیقی کتاب پیش کر رہا ہے۔جس میں ڈیپلائی صاحب کی شخصیت اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ ہوگا۔

جستہ جستہ

پچھلے صفحات پر ممتاز اہل قلم اور مشاہیر کی تنقیدی و توصیفی آرا، پیش کی گئی تاہم میرے مطالعے میں ڈیپلائی صاحب کے ادب دوست و ذی علم فرزندان اور نور چشمی کی متعدد نگارشات کے علاوہ کچھ صاحبانِ علم و ادب کے مضامین بھی آئے جن سے موصوف کی یگانۂ روزگار شخصیت اور عہد آفریں فن پر روشنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی لائق و فائق بیٹی ڈاکٹر ثریا سوز مرحومہ کی بہت سی سندھی تحریروں کے علاوہ اردو میں بھی کچھ ایسی نگارشات ہیں جن میں بڑی دلکشی ہے۔ مثلاً ۹ر فروری ۱۹۸۳ء کو روز نامہ جنگ کراچی کے مڈ ویک میگزین میں 'مہران رنگ' کے زیرِ عنوان جو تاثراتی مضمون افسانوی انداز میں "کہانی دیے اور طوفان کی" ہے۔ اس کے آغاز سے پہلے 'مہران رنگ' کے مرتب اظہر ضیائی تحریر کرتے ہیں:

"مرحوم عثمان ڈیپلائی سندھ کے نامور صحافی اور ادیب تھے۔ متعدد اخبارات اور جرائد جاری کرنے کے علاوہ انہوں نے تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر کتابوں کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ انتہائی خوش مزاج، زندہ دل اور باہمت انسان تھے۔ ادب و صحافت سے ان کی لگن بے مثال تھی۔"

محترمہ ثریا سوز ڈیپلائی نے اپنے والد محترم کو بڑے اچھوتے انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جس کے کچھ دلکش نقوش درج ذیل ہیں مثلاً:

"لوگ اپنے شہر کی وجہ سے مشہور ہوتے ہیں لیکن ہمارا گاؤں بابا کی وجہ سے مشہور ہوا۔ وہ ایک روشن دیے کی مانند تھے جسے زمانے کی تند و تیز ہواؤں نے بجھانا چاہا لیکن وہ سر اُٹھائے بڑے سے

بڑے طوفان کا مقابلہ کرتے رہے۔''

''ہمارے گاؤں میں سنہری ریت کے ٹیلے ہیں اور زہریلے سانپوں کی بہتات۔ اگر وہاں بارش ہوجائے تو کشمیر کہلائے اور بارش نہ ہو تو زمین کے آس پاس اس کی حالت زار پر بہانے کو آنسو کا ایک قطرہ تک نہ ہو۔''

ایک تاثراتی مضمون ڈیپلائی صاحب کے فرزند عبدالرحمان ڈیپلائی کا ہے جس میں کئی دلچسپ واقعات بیان کیے گئے ہیں جن سے اس مردقلندر کی شخصیت اُبھرتی ہے:

ایک واقعہ عبدالرحمان نے بیان کیا ہے کہ:

''میں سعودی عرب سے بابا کے ذاتی خرچ کے لیے ہر مہینے کچھ رقم بھیجتا تھا پر ان کا اپنے اخبار اور پریس کے لیے محبت کا یہ ثبوت ہی کافی ہے کہ انہوں نے مجھے خط میں لکھا کہ ''یار عبدالرحمان! آج تمہارے تین سو روپے ملے، نہیں تو روشنائی اور کاغذ کے لیے پیسے ہی نہیں تھے۔ کمپوزنگ ٹھپ ہوگئی تھی فوراً روشنائی اور کاغذ منگوایا اور کمپوز شدہ میٹر چھپ گیا۔''

ڈیپلائی صاحب کے بڑے صاحبزادے محمد علی ڈیپلائی نے ایک سعادت مند اور فرض شناس بیٹے کی حیثیت سے نہ صرف اپنی تحریری صلاحیتوں سے بلکہ عملی جدوجہد اور مالی وسائل سے خاطر خواہ کام لیتے ہوئے قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:۔

''ڈیپلائی صاحب سندھی ادب اور صحافت میں ۱۹۳۵ء سے اپنی وفات تک عوامی مقبولیت کے اعلیٰ ترین درجے پر رہے۔

سندھی ساج کے بے لوث کارکن اور بے ریا نقاد کامریڈ میر محمد تالپور سے جب یہ سوال کیا گیا کہ:

''آپ کی نظر میں سندھ کا بڑا ادیب کون تھا جس کی کتابیں عام لوگ شوق سے پڑھتے رہے ہیں؟ کامریڈ نے جواب میں کہا'' سندھ دھرتی نے کتنے ہی مشہور ادیب پیدا کیے ہیں جو اپنا اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں اس بیسویں صدی کے آخر میں بڑے ادیب مرحوم محمد عثمان

ڈیپلائی تھے جنہوں نے ڈیڑھ سو کتابیں لکھیں اُن کی یہ کتابیں ہمارے عوام شوق سے پڑھتے ہیں مثلاً مرشد کی داڑھی ، مرشد کی ٹانگیں اور شرک توڑ لال جھنڈا وغیرہ۔''

ادبی دنیا میں ایسے ادب لکھنے والے بیشمار رہے جنہوں نے اپنی تحریروں میں تو انسانیت نوازی اور اخلاقی اقدار کا بڑا پرچار کیا ہے لیکن ان کی اپنی عملی زندگی ان کے آدرش کی تکذیب کرتی رہی گویا 'گندم نما جو فروش' ہونے کا اطلاق ایسی ہی ادبی شخصیات پر ہوتا ہے مگر ڈیپلائی صاحب کو قول و عمل کھلی کتاب کے مانند تھا، اسی لیے بہت سے ادب دوستوں نے ان کا نیاز مند ہوکر اور ان کی تصانیف سے متاثر ہوکر لکھنا شروع کیا اور شہرت و مقبولیت پائی۔

پروفیسر ظفر حسن شاہ مرحوم کو ڈیپلائی صاحب سے بڑی عقیدت تھی ۔ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ:

'' سندھ میں شاید ہی کوئی ایسا پڑھنے والا رہا ہو جس نے ڈیپلائی کی کوئی کتاب نہ پڑھی ہو اور ان کا نام نہ سنا ہو۔''

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا ''اس کا سبب کیا ہے؟

کیوں ہم میں سے اکا دکا قلمکاروں کو چھوڑ کر باقی بہت سے لکھنے والوں کو ڈیپلائی جیسی مقبولیت نصیب نہ ہوئی ؟

پروفیسر صاحب نے اپنے اُٹھائے ہوئے سوالوں کا جواب بھی خود ہی رقم کیا ہے جو ڈیپلائی صاحب کے حوالے سے کچھ یوں ہے:

(۱) مسلسل اور لگن کے ساتھ لکھنا

(۲) اُن مسئلوں اور حالتوں پر لکھنا جو غریب اور پسماندہ عوام سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۳) اُن تکراری مسائل پر لکھنا جن کی اس خاص دور میں بڑی اہمیت ہے۔ حالانکہ ایسے سنگین مسائل پر لکھنے کی پاداش میں کتابوں پر بندش لگی اور جیل بھی جانا پڑا۔

(۴) ہر دور میں جو بھی حکومت ہو اس کے آگے سچ کہنا۔ چاہے برسر اقتدار آنے سے پہلے

ارباب سیاست کی توصیف ہی کیوں نہ کی جا چکی ہو۔

(۵) اپنی تحریروں، جیل میں رہنے اور کئی دوسری ذاتی قربانیوں کے بدلے میں حکومت یا عوام سے کبھی بھی کوئی معاوضہ طلب نہ کرنا۔

۲۹راگست ۲۰۰۲ء کو سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ڈیپلائی صاحب کی چند کتابوں کے نئے ایڈیشن کی تقریب تعارف منعقد کی گئی۔ کتابوں کے نام "قرآن پاک کا سندھی ترجمہ"، ناول 'سانگھڑ' کا اردو ترجمہ اور ناول 'نورِ توحید' ہیں۔

اس تقریب کے مہمانِ خصوصی سابق وفاقی وزیر ڈاکٹر عبدالحفیظ شیخ تھے۔ موصوف نے فرمایا:

"آج کی تقریب سندھ کے ایک ہیرو کے بارے میں ہے ۔ہم یہاں جمع ہوکر یہ دیکھنے کی کوشش کررہے ہیں کہ اس شخص کا ہماری زندگی اور اکیسویں صدی پر کیا اثر ہو رہا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ سندھ میں لوگ ایک دوسرے کی تعریف کم ہی کرتے ہیں، کوئی کتنا ہی زبردست انسان ہو اس کو چاہے ساری دنیا مانے لیکن ہم مشکل ہی سے اسے مانتے ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی کہ میں نے ڈیپلائی صاحب کو پڑھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان سے میرا ذاتی تعلق ہے کیونکہ صرف سندھ ہی نہیں بلکہ پاکستان میں ایسے اہلِ قلم کم ہوں گے جنھوں نے ڈیڑھ سو کتابیں لکھی ہوں۔

ڈیپلائی صاحب نے اخبار 'عبرت' نکالا جو آج تک جاری ہے اور جاری رہے گا۔ انہوں نے ہمیشہ سچی بات کی اور سچائی کے کارن جسمانی، ذہنی اور مالی تکلیفیں برداشت کیں جنھوں نے زندگی میں مسلسل جدوجہد کی۔ ایم این اے اور وزیر ہونے کے لیے یا ڈیفنس میں کوٹھی بنانے کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے جنھیں وہ اپنا دوست سمجھتے تھے اور جن کو یہ سمجھانا تھا کہ کس طرح بہتر اور کارآمد زندگی بسر کریں ۔ وہ اُن کے مدِ مقابل اُٹھ کھڑے ہوئے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرتے رہے، جن لوگوں نے عوام کو پسماندہ و در ماندہ رکھا ہے۔

میں سمجھتا ہوں ایک طرف یہ بڑے دکھ کی بات اور دوسری طرف ایک اچھائی کی بات بھی ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ میں نے جب ان کی کتابوں کو پڑھنے کی کوشش کی تو مجھے ہر گھڑی ایسا محسوس

ہوتا رہا کہ سندھ تو اب بھی اسی حال میں ہے جس حال میں ڈیپلائی صاحب نے دیکھا تھا۔

میں جب بھی سندھ کا دورہ کرتا ہوں، نوجوانوں سے ملتا ہوں، خواتین سے رابطہ ہوتا ہے یا عام لوگوں کو دیکھتا اور سنتا ہوں تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ اوباڑو سے اورنگی تک، کیماڑی سے کشمور تک ایک مایوسی چھائی ہوئی ہے۔ لوگوں کو احساس ہے کہ زندگی رواں دواں ہے اور وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔ دنیا کی قومیں ترقی کر کے آگے بڑھ چکی ہیں مگر ہم وہیں کے وہیں ہیں آخر کیوں؟

ہماری قومی تحویل میں ہر شے اور ہر نعمت ہے تو پھر ہمارے لوگ کیوں غریب ہیں؟ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ سندھ کو بلکہ پاکستان کو اچھی قیادت نہ ملی، لوگ اس لیے غریب ہیں کہ انہیں لوٹا گیا ہے۔ ڈیپلائی نے جو جدوجہد کی وہ لوگوں کو صحیح معنوں میں علم دینے، اور باخبر رکھنے کے لیے تھی۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ اب ان سے گہری دوستی ہوگئی ہے۔ کوشش کروں گا کہ جو ڈیپلائی صاحب کا پیغام ہے اور جس سے بہتوں کو آشنا ہونا چاہیے، میں اپنے طور پر اس پیغام کو وسیع حلقے تک پہنچاؤں گا، جہاں بھی جاتا ہوگا، ان کا پیغام میرے ساتھ ہوگا۔

کلاسیکل تحریروں کی اشاعت نو

حال ہی میں ڈیپلائی صاحب کے کلاسیکل تحریروں کی اشاعتِ نو کے سلسلے میں 'مہران اکیڈمی' شکارپور نے اُن کی مندرجہ ذیل دس کتابیں شائع کی ہیں جنہیں عوام میں بڑی پذیرائی ملی ہے:

۱۔ نیل کنوار
۲۔ دختر اسلام
۳۔ چین جو چنڊ
۴۔ افریقہ جي شهزادي
۵۔ سیرت فاطمہؓ
۶۔ خلفاء راشدینؓ
۷۔ ارشادالخلفاء
۸۔ قرآني خزانو
۹۔ آخري اميد
۱۰۔ سیرت رسول ﷺ۔

Scanned with CamScanner

'مسلم اُمت' کے خواب سے قوم پرستی کی جانب سفر

''ڈیپلائی صاحب کے سیاسی نظریات کا آغاز شروعات 'اُمتِ اسلامیہ' کے تصور سے ہوا۔ یہ تصور ان کے ذہن پر ۱۹۳۴ء سے ۵۰-۱۹۴۹ء تک پوری طرح حاوی رہا۔ درمیانی عرصے میں صرف اس حد تک ترمیم یا تبدیلی ہوئی کہ برصغیر مسلمانوں کے لیے وہ پاکستان کی تشکیل و تحریک سے متفق ہو گئے۔ ان کے خیال میں 'عالمی اُمتِ اسلامیہ' کے قیام کے پہلے مرحلے میں پاکستان کا قیام ضروری تھا۔ ان کی سوچ تھی کہ مسلمانوں (بشمول سندھی مسلمان) کی راہ نجات اسلامی حکومت کے قیام میں مضمر ہے۔ اس سوچ میں وہ اس قدر پختہ تھے کہ جماعت اسلامی کی 'اُمتِ اسلامیہ' والی سوچ کا کٹر حامی ہونے کے باوجود، پاکستان تحریک، محمد علی جناح اور مسلم لیگ کی بہت زیادہ حمایت کرتے رہے۔ ان دنوں اسلامی جذبے سے سرشار ڈیپلائی کے نزدیک صوبائی، قومی اور لسانی مسئلوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

اپنے فکری ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

''جب اسی احساس سے تمام اسلامی ملکوں اور پاکستان کے باہمی تعلقات مشرق کے موجودہ حالات اور مشرق و مغرب کی بین الاقوامی صورت حال کا جائزہ لیا تو اس حقیقت کو سب سے اہم اور ضروری محسوس کیا کہ سب سے اوّل ہے اپنا وجود، اس کے بعد اپنا گھر اور وطن پھر مزید باتیں سوچی جا سکتی ہیں۔''

اس کے بعد والی عبارتوں میں ڈیپلائی صاحب کا لہجہ بہت تند و تیز اور تلخ تر ہو گیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ جب اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خان کے مارشل لاء کا دور آیا تو حیدر بخش جتوئی، سوبھو گیان

چندانی اور قاضی فیض محمد جیسے سندھ کے قائدین کے ساتھ ڈیپلائی صاحب کو بھی کچھ عرصہ حیدرآباد جیل میں رکھا گیا اور پھر شاہی قلعہ لاہور بھیج دیا گیا۔ محمد علی ڈیپلائی نے بیان کیا ہے کہ:

''ڈیپلائی صاحب کو آزاد کرانے کی کوشش میں ان کے ایک قریبی عزیز قاضی احمد وکیل لاہور میں مغربی پاکستان کے ہوم سیکریٹری ابونصر سے ملے اور انہیں بتایا کہ ڈیپلائی صاحب ایک غریب و شریف عیال دار انسان ہیں ان کو خواہ مخواہ قید کیا گیا ہے۔ جواب میں جو کچھ کہا گیا اس نے قاضی صاحب کے ہوش اُڑا دیئے۔ قاضی صاحب کی اپیل کے جواب میں ہوم سیکریٹری نے آگ بگولہ ہوتے ہوئے کہا ''آپ اس شخص کو شریف و غریب کہتے ہیں۔ یہ تو انتہائی خطرناک آدمی ہے۔ یہ تو سندھ کا بھاشانی ہے۔''

قاضی صاحب کے کہنے کے مطابق ''وہ گئے تو تھے ڈیپلائی صاحب کو آزاد کرانے مگر بذات خود اس اندیشے میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں ان کو گرفتار نہ کرلیا جائے۔''

اهم اعزازت

۱۔ صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی (بعد از وفات)

۲۳ مارچ ۲۰۰۴ء کے تاریخی دن ایوان صدر میں منعقدہ ایک پُر وقار تقریب میں صدر پاکستان نے ڈیپلائی صاحب کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی (بعد از وفات) سے نوازا۔ اس موقعے پر صدر مملکت نے فرمایا:

''جناب ڈیپلائی نے ۱۵۰ کتابوں کے علاوہ کہانیاں، مضامین، اداریئے اور کالم لکھے ہیں۔ انہوں نے لکھنے کا آغاز ۱۹۲۵ء میں ۱۶ برس کی عمر میں کیا اور سندھ کے مسلمانوں کی بیداری اور غلامی سے نجات کی جنگ میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے اپنی تحریروں کو سماجی برائیوں کے خاتمے پر مرکوز رکھا۔

''محمد عثمان ڈیپلائی مشہور سندھی روزنامے 'عبرت'، 'سندھ ٹائمز' ہفت روزہ 'انسان' اور ماہنامہ 'Saneh Digest' کے بانی مدیر تھے۔ آپ کے اہم ادبی کاموں میں 'قرآن شریف کا سندھی ترجمہ'، شاہ عبداللطیف بھٹائی کے 'شاہ جو رسالو' کی جامعہ تدوین، 'نورِ توحید'، 'اتاترک'، 'سانگھڑ' اور 'انقلاب ایران' شامل ہیں۔''

پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے انعامات:

محمد عثمان ڈیپلائی کو پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے ۱۹۶۳ء میں ''سانگھڑ'' اور ۱۹۸۰ء کے لیے ''انقلاب ایران'' پر بہترین سندھی ناول کا ایوارڈ دیا گیا۔

۲۔ تحریک پاکستان ایوارڈ ۱۹۸۷ء

۱۴؍اگست ۱۹۸۷ء کو وزیرِ اعلیٰ سندھ نے ایک پُروقار تقریب میں ڈیپلائی صاحب کو تحریک پاکستان ایوارڈ سے نوازا۔ ایوارڈ کی Citation میں درج ہے کہ:

"Mr. Muhammad Usman Diplai is conferred this award in recognition of his meritorious services rendered in the struggle for Pakistan. The contribution made to achieve our cherished goal will always be remembered in the appreciation and respect."

۳۔ سندھ یونیورسٹی

سندھ یونیورسٹی کے سینڈیکیٹ نے ڈیپلائی صاحب کی ادبی اور صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سندھ یونیورسٹی کیمپس میں ایک اہم روڈ کو ان کے نام سے منسوب کیا ہے۔ سندھ یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری اسی روڈ پر واقع ہے۔

۴۔ انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی (سندھ یونیورسٹی)

انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی مشاہیر سندھ کے لیے مختص کی ہوئی گیلری کے ایک گوشے میں ڈیپلائی صاحب corner قائم کیا ہے جس میں اُن کا پورٹریٹ اور ذاتی استعمال کی اشیاء کو محفوظ کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ڈیپلائی صاحب کی ذاتی لائبریری کے لیے بھی انسٹیٹیوٹ کے کتب خانہ میں ایک خصوصی گوشہ قائم کیا گیا ہے۔

کتابیات و حوالہ جات

۱۔ ''محمد عثمان ڈیپلائی۔ انسان دوست ادیب اور بیباک صحافی''۔ مرتبہ۔
تاج جویو پیشکش محمد عثمان منگی، سرپرست اعلیٰ، سندھ مائک موتی تنظیم،
حیدرآباد۔ جولائی ۲۰۰۳۔

۲۔ ''ادب زاویے'' ترتیب و تدوین: عبدالجبار آثر اور قیصر جہاں ہاشمی،
سلسلہ پبلی کیشنز۔

۳۔ سہ ماہی 'مہران' شمارہ ۱، ۲، ۳۔ ۱۹۵۶، شمارہ ۱۔۲ ۱۹۵۷، شمارہ ۳۔۴۔
۱۹۵۷، شمارہ ۲۔۳ ۱۹۶۱، شمارہ ۳۔۴۔ ۱۹۸۰، شائع کردہ: سندھی ادبی بورڈ،
جام شورو، سندھ

۴۔ ماہنامہ ''نئین زندگي'' حیدرآباد۔ اکتوبر ۱۹۶۱، دسمبر ۱۹۶۱، اپریل ۱۹۶۲،
جون ۱۹۶۲، اکتوبر ۱۹۶۲، اگست ۱۹۶۷، اور اپریل ۱۹۸۲، کے شمارے

۵۔ ''سنڌي نثر جي ڪن صنفن جو اڀياس'' تحقیق تصنیف۔ پروین موسیٰ
میمن، شائع کردہ: ہائر ایجوکیشن کمیشن۔ اسلام آباد۔ ۲۰۰۸

۶۔ 'سانگھڑ' ناول (اردو ترجمہ) ڈاکٹر ثریا سوز ڈیپلائی۔ ۲۰۰۲، فکشن ہاؤس ۱۸،
مزنگ روڈ، لاہور

۷۔ 'جدید سندھی ادب' میلانات، رجحانات، امکانات، تحقیق و تحریر۔ سید مظہر جمیل۔

شائع کردہ۔ اکادمی بازیافت۔ کراچی ۲۰۰۴ء۔

۸۔ 'مھراڻ ,شاعر نمبر۔۱۹۶۳ء، سندھی ادبی بورڈ۔ جام شورو

۹۔ روزنامہ 'ڈان' ۷ر فروری ۱۹۹۱ء

۱۰۔ سنڌي ادب جو ادبي جائزو ۽ لطيفيات تحقیق و تحریر۔ پروین موسیٰ میمن
ناشر: روشنی پبلیکیشن۔ کنڈیارو۔ ۲۰۰۴ء

۱۱۔ روزنامہ The News ۱۱راگست ۲۰۰۲ء

۱۲۔ روزنامہ 'The Nation' ۷راگست ۲۰۰۲ء

۱۳۔ ماہنامہ 'تحریک' اگست، ۲۰۰۸

۱۴۔ Dawn.Books and Authers ۲۲رجون ۲۰۰۸

۱۵۔ News and opinion مارچ۔ اپریل ۲۰۰۸ء